فلسفۂ تعلیم و تربیت

رئیس احمد جعفری

فلسفۂ

تعلیم و تربیت

رئیس احمد جعفری



فلسفہ تعلیم و تربیت

(روح التربیۃ والتعلیم)

تالیف

محمد عطیہ الابراشی
(آف آکسفرڈ یونی ورسٹی)
پروفیسر تربیت و علم النفس دارالعلوم مصر

مترجمہ

رئیس احمد جعفری

قیمت چھ روپے

ناشر

چمن بکڈپو۔ اردو بازار۔ دہلی

مطبوعہ

(مطبوعہ خواجہ پریس دہلی) ۔ دہلی

فہرس

قیمت چھ روپے

ناشر

چمن بکڈپو۔ اردو بازار۔ دہلی

مطبوعہ

(مطبوعہ خواجہ پریس دہلی) ۔ دہلی

فہرس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فلسفہ تعلیم و تربیت

مقدمہ

زیرِ نظر کتاب، اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے، میرا خیال ہے، اُردو کیا، انگریزی زبان میں بھی، تعلیم و تربیت پر ایسی جامع و مانع، مکمل و مدلّل، اور موضوع کے تمام گوشوں پر حاوی کتاب نہیں ملے گی۔
مصر تیزی سے ترقی کر رہا ہے، اور زندگی کے ہر گوشہ میں اس کی ترقیاں حیرت خیز اور لائق رشک ہیں۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی، وہ اسلامی ممالک کو بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ خالص علمی اور فنی عنوانات پر مصر نے ایسی مستند اور جامع کتابیں شائع کی ہیں، جو مصر تو مصر، امریکہ، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتی ہیں؛

یہ کتاب "فلسفۂ تعلیم و تربیت" جس وقت نظر تحقیق اور کدوکاوش

سے مرتب کی گئی ہے۔ اس کی افادیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید اور متمتع ہوں۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے اسے عربی سے اردو میں منتقل کیا ہے، اور مجھے امید ہے۔ اردو جاننے والا ہر باپ، ہر ماں، ہر طالب علم، ہر مدرس ہر پروفیسر اس کا مطالعہ کر کے، اپنے اقدام و عمل اور فکر و نظر کی کئی راہیں تلاش کرے گا۔

شیخ نیاز احمد صاحب مالک کتاب منزل (کشمیری بازار لاہور) اردو داں طبقہ کے شکر و سپاس کے مستحق ہیں کہ ناولوں اور افسانوں کی طلب کے اس دور میں، وہ ایسا صحت مند اور تعمیری لٹریچر پیش کرنے کی جرأت کر رہے ہیں۔ یہ کتاب اس کی مستحق ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں اس سے پورا استفادہ کیا جائے۔

رئیس احمد جعفری

تربیت اور اس کا مفہوم

تربیت، اس کی تعریف اور اس کے اغراض و مقاصد سے متعلق ماہرین فن میں اختلاف ہے، ذیل میں بعض قابل ذکر تعریفات ہم درج کرتے ہیں :۔

مختلف تعریفیں

(۱) تربیت کا مفہوم یہ ہے کہ جسم و روح کو سراپا جمال بنا لیا جائے، اور ان دونوں کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا جائے۔ (افلاطون)

(۲) تربیت کی تعریف یہ ہے کہ اس سے عقل درجۂ کمال کو پہنچتی ہے، اور قلب ارتقا کے آخری مدارج طے کرتا ہے۔ (جولیس سائمن)

(۳) تربیت کی غرض و غایت ہے عقل کو حصولِ علم کے لیے تیار کرنا، جس طرح زمین کھیتی باڑی کے لئے تیار کی جاتی ہے (ارسطو)

(۴) تربیت وہ جوہر ہے، جو انسان کو ہر کام کا اہل بنا دیتی ہے خواہ وہ کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو، طبیعت میں گہرائی سوجھ بوجھ اور مہارت پیدا کر دیتی ہے، خواہ امن کا زمانہ ہو یا جنگ کا (جان ملٹن)

(۵) تربیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو، حیاتِ کاملہ برتنے کا گر سکھایا جائے (اپینالوزی)

(۶) تربیت کا مدعا یہ ہے کہ بچّہ کے قوائے ذہنی کو نشو و نما کا پورا موقع دیا جائے (ہربرٹ اسپنسر)

(۷) تربیت بچّہ کی طبیعت کو سنوارتی ہے، تاکہ وہ اچھی، نیک اور سچّی زندگی بسر کر سکے۔ (صلی)

(۸) تربیت سے مراد یہ ہے کہ ممکن حد تک کمال کا درجہ انسان حاصل کرلے۔ (کاؤنٹ)

(۹) تربیت کا مقصد یہ ہے کہ فرد امکانی حد تک اپنے ابنائے قوم کے کام آئے۔ ان کی مدد کرے (ڈبلیو، ٹی۔ ہارلیس)

(۱۰) تربیت، انسان کو پہلے اپنی مدد کرنا، پھر دوسرے کے کام آنا سکھاتی ہے۔ (جیمز مل)

(۱۱) تربیت کاملہ وہ ہے جو انسان کی جسمانی صحت کو محفوظ رکھتی ہے اور قوّتِ بدنیہ کو سنوارتی ہے، جو اس کے قوائے عقلی و جسمانی کی نگہداشت کرتی ہے۔ تیزی فہم پیدا کرتی ہے، اور ذکاوت و ادراک بڑھاتی ہے فکر و نظر میں گہرائی پیدا کرتی ہے، شعور میں نفاست اور جلا پیدا

کرتی ہے، اپنے فرائض، ضمیر کی روشنی میں ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتا ہے (ببیل)

موازنہ آرا سچ پوچھیے تو اپنی اپنی جگہ یہ ساری تعریفیں صحیح اور درست ہیں، ہماری رائے میں تربیت کا درست اور صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ انسان میں کامل معیار کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اس سے بہرہ ور ہوکر انسان اچھی زندگی بسر کرتا ہے۔ وطن کی محبت اس کے دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔ جسم مضبوط و توانا بن جاتا ہے، اخلاق میں کامل اور یکتا بن جاتا ہے۔ اس کی فکر میں ضبط و نظم ہوتا ہے۔ اس کا شعور نازک اور حساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے کام میں ماہر اور سبک دست ہوتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ تعاون اور اشتراک کرتا ہے۔ اس کے قلم اور زبان سے جو بات نکلتی ہے، وہ جچی تلی، اور موزوں و مناسب ہوتی ہے۔ وہ جو کام کرتا ہے، خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے۔ اگر تربیت صحیحہ کاملہ سے ہم مذکورہ اغراض و مقاصد حاصل کرلیں، اور یہی ہمارا مقصد و منشا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے، کہ وطنی، جسمی، خلقی، عقلی، وجدانی، عملی، اجتماعی، جمالی، لغوی، ہر قسم کی تربیت حاصل ہوگئی، اور انسان، انسان کامل بن گیا۔

(۲)

تربیت کی اہمیت

فرد ــــ اور ــــ جماعت کے لئے

فرد اور جماعت کا مدارِ کامرانی تمام تر صحیح اور موزوں تربیت پر ہے، یہی وجہ ہے کہ متمدن حکومتیں بڑی دریا دِلی سے تعلیم و تربیت پر روپیہ صرف کرتی ہیں، انھیں معلوم ہے کہ تعلیم بجائے خود ایک قوت ہے، بہت بڑی قوت۔ تعلیم ہی کا سہارا لے کر آدمی ترقی کرتا اور جماعت آگے بڑھتی ہے، اسی کی بدولت ترقی یافتہ مطمئن اور آسودہ، زندگی کی نعمت اور برکت حاصل ہوتی ہے تاریخ سے بڑھ کر اس حقیقت کا کوئی شاہد نہیں کہ صحیح تربیت اور تعلیم نے، قوموں کو موت کی جاں کنی سے نکال کر، زندگی کی شاہراہ پہ لاکر کھڑا کر دیا، ملکوں کو غفلت کی نیند سے جگا کر، دانش اور ہوشیاری کے ایوان میں پہنچا دیا، جو اپنے تئیں بھول چکے تھے انھیں چونکایا، اور چونچال کر دیا، اُن کی آہنی بیڑیاں کاٹ دیں، اور آزلوں مرپا سیف پہ لا بٹھایا، موسبرہ کے باشندوں

کو تعلیم ہی کے ذریعہ پستالوزی نے جگایا اور بیدار کیا، انھیں پکارا، اور راہ پر لایا، یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی میں بھی سرخرو رہا۔ اور موت کے بعد بھی پوجا گیا، صرف موبسرہ میں نہیں، ساری دنیا میں پوری کائنات میں، آج موبسرہ کی آزادی تمام تر رہینِ منّت ہے، پستالوزی کی یادگار تعلیم کی، اُسے ہرگز آزادی نہ ملتی، اگر تعلیم کا دامن اس کے ہاتھ میں نہ ہوتا۔

نپولین نے پروشیا کو شکست دی، زبردست اور یادگار ہزیمت اس نے پروشیا کی قوت توڑ دی، اور پھر یہ قوم اس وقت تک نہیں اُبھر سکی، جب تک اس میں تعلیم عام نہ ہو گئی ــ اور تربیّت کے دروازے سب کے لیے نہ کھل گئے۔ ایک موقع پر بسمارک نے کہا تھا، ہم اپنی پڑوسی قوم پر سپاہیوں سے زیادہ معلّموں کے بل پر غالب آئے۔

اسکاٹ لینڈ کی مثال

انگریزی کے ایک مشہور جج اور ادیب کا خیال تھا کہ اسکاٹ لینڈ کے دورِ جہالت میں شقاوت عام تھی۔ قانون کی نہ کوئی وقعت تھی نہ اہمیّت، جرائم پیشہ لوگ ہمہ وقت، امن و امان میں خلل ڈالا کرتے تھے۔ لوگوں کے سکون اور یک سوئی میں حارج ہوا کرتے تھے۔ اسکاٹ لینڈ نام ہی ایک مستقل عیب بن گیا جب بھی اس کا ذکر کیا جاتا حقارت اور ذلت کے ساتھ،

لیکن جب وہاں عمومی طور پر جبری تعلیم کا قانون نافذ ہوا، اور ناخواندہ لوگوں کی تعلیم کا پروگرام عمل میں لایا گیا، اور بچے غول کے غول مکتبوں اور مدرسوں میں پہنچنے لگے۔ تو اسی بدنام اسکاٹ لینڈ کی کایا پلٹ گئی ۔ اب لوگوں کی زبانوں پر اس کا ذکر تعریف و توصیف کے ساتھ آنے لگا، اُس کی فکر بلند ہوگئی، اس کا اخلاق سنور گیا، آداب و اوصاف میں بہت آگے بڑھ گیا، دُنیا نے ایسی مثالیں بہت کم دیکھی ہوں گی۔

اسکاٹ لینڈ کی آب وہوا اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی، وہاں کے شجر و حجر اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھے۔ وہاں کے مناظر طبیعی بھی وہی ہیں، اور ان میں کوئی فرق نہیں آیا، لیکن قوم بدل گئی، اور یہ تغیّر، کس نے کیا؟ تعلیم نے! تعلیم نے اس میں تغیّر پیدا کیا کہ وہ دنیا کی بہت بڑی قوم بن گئی، طبیعت اور مزاج میں، اخلاق و عادات میں، فہم و تدبّر میں، اقتصاد و صنعت میں، تجارت اور کاروبار میں، ہر باب میں، ہر چیز میں، اس نے تغیّر قبول کرکے ایک نئی زندگی کی عمارت تعمیر کرلی، اور اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکاٹ لینڈ ہی کے کاندھوں نے، انگریزی شہنشاہیت کا بوجھ اٹھایا، اور اسکاٹ لینڈ ہی کے ہاتھوں نے برطانوی سامراج

کی بنیاد رکھی ۔

روس کی مثال

دسویں صدی میں ، اور گیارھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں، یورپ کے حکمران ، اور حکام سراپا ظلم و استبداد تھے ، اور خاص طور پر روس میں تو ظلم و جور کی چکی بڑی تیزی سے چل رہی تھی ۔ یہ برسر اقتدار طبقہ ہمیشہ اس سے ڈرتا رہا ۔ کہ عوام کہیں دولت علم سے مالا مال نہ ہو جائیں ، اس کا عقیدہ تھا عوام میں تعلیم کا وہی تناسب ہونا چاہیئے ۔ جو کھانے میں نمک کا ہوتا ہے ۔ زیادہ ہوا ، اور ذائقہ بگڑا ، ان لوگوں کا مقولہ تھا ۔ "آج کے غریبوں کو تعلیم دو ۔ کل یہ تمہارے مخالف ہو جائیں گے "

لیکن آج تجربہ نے ، اور تاریخ نے ثابت کر دیا کہ حکمران طبقہ کا یہ وہم کتنا غلط اور بے بنیاد تھا اور دنیا جان گئی کہ تعلیم ہی ، عوام کو قابو میں رکھنے اور انھیں راہِ راست پر لانے کا بہترین ذریعہ ہے ، تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام کی فکر رسا ہو جاتی ہے ، سیدھے راستہ پر چلنا آسان ہو جاتا ہے ، عقل دور اندیش بن جاتی ہے ، اچھائی اور برائی میں امتیاز پیدا ہو جاتا ہے ، کھوٹے میں سے کھرے کو چھانٹ لینے کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے ، ورنہ جاہل ہمیشہ ہوا کے رُخ پر چلتا ہے ، جیسے ایک

تنکا، جسے جب چاہے ہوا اُڑائے جائے، اور جدھر چاہے اُڑا لے جائے، وہ ہوا پر بھروسہ کرتا ہے، اپنی عقل پر نہیں پر

برطانیہ کی مثال

۱۹۲۰ء میں حکومت برطانیہ نے محسوس کیا کہ وہ بعد از جنگ قرض کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے، چنانچہ کفایت اور بچت کا پروگرام بنا کر بہت لمبی کانٹ چھانٹ حکومت کے مصارف میں کی گئی، اس سلسلہ میں کچھ کمی محکمۂ تعلیم میں بھی کی گئی، بس پھر کیا تھا ایک طوفان برپا ہو گیا، انگریز قوم کے مفکّروں اور مدبّروں کی طرف سے بڑا سخت مورچہ حکومت کے خلاف قائم کر دیا گیا، ان لوگوں کا مطالبہ تھا، ہر چیز میں تخفیف کر دو ہمیں ذرا بھی اعتراض نہیں، لیکن خبردار تعلیم کے بجٹ میں ایک پائی کی بھی کمی نہ ہونے پائے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز قوم تعلیم کو کیا اہمیّت دیتی ہے۔ اور اس راہ میں ہر قربانی کے لیے کس طرح تیار اور آمادہ رہتی ہے۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، تعلیم کی عمومیّت سے قوم اور ملّت کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ اگر مجرمین کے اعداد و شمار پر غور کیا جائے کہ دَورِ جہالت میں ان کا تناسب کیا تھا، اور تعلیم کے بعد کیا رہا، تو صاف معلوم ہو جائے کہ انسان کی سیرت پر تعلیم و تربیّت کس طرح اثر انداز ہوتی ہے؟ اس کا

اثر صرف فرد پر نہیں پڑتا، بلکہ جماعت پر بھی پڑتا ہے۔ وکٹر ہیوگو نے کتنی سچی بات کہی ہے "جس نے مدرسہ کھولا، اس نے جیل خانہ کے دروازے پر تالا لگا دیا" ! یہ قول اس کا مستحق ہے کہ موٹے اور روشن حرفوں میں، ہر مکتب و مدرسہ پر، اور ہر میدان میں آویزاں کر دیا جائے ؛

تعلیم وتربیت

ان حالات میں یہ بات باعثِ حیرت نہیں کہ انگلستان میں ذہین لڑکوں کی اس طرح پرورش اور پرداخت کی جاتی ہے، جیسے نازک پھولوں اور کلیوں کی، تاکہ وہ پروان چڑھیں، اور قوم ان کی ذکاوت اور ذہانت سے فائدہ اٹھائے، وہاں ابتدائی، پھر ثانوی، پھر جامعاتی تعلیم کی حوصلہ افزائی پر بڑا زور دیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں اگر لارڈ برکن ہیڈ کا ذکر کیا جائے، تو شاید بے جا نہ ہو، یہ وہی بزرگ ہیں، جو ۱۹۲۹ء میں مزدور گورنمنٹ کے سربرآوردہ وزرا میں تھے، یہ ایک غریب گھرانے کے پیداوار تھے، ابھی آغوشِ مادر میں تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا، ماں نے اس نونہال کی، اور اس کے بھائیوں کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ کی۔ برکن ہیڈ میں ذہانت زیادہ دیکھی، اس لئے اس کی طرف زیادہ متوجہ ہوتی، ہر وقت اسے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتی، یہ آکسفورڈ گیا تاکہ وہاں سے ابتدائی امتحان پاس کرے، جب اتنی

خالی تھی کہ واپسی کا کرایہ تک نہیں تھا، لیکن وہ امتحان میں کامیاب ہو گیا، اور سرٹیفکیٹ مل گیا، اسی سرٹیفکیٹ پر، اس کے مستقبل کا انحصار تھا، اب اس کی پوچھ ہونے لگی، اُمرا کے لڑکوں کے ساتھ وہ تعلیم حاصل کرنے لگا۔ اس کی ذہانت برابر اپنا سکہ بٹھا رہی تھی، وہ تقریر بڑی سلجھی ہوئی کرتا تھا، اس کی باتوں میں بڑائی جھلکتی تھی، خیالات مدلل، اور باتیں تاثیر سے لبریز، ایک انتخابی جلسہ میں آنجہانی مسٹر جوزف چیمبرلین تشریف لائے، انھیں یہ نوخیز طالب علم بہت بھایا، موصوف نے اس طالب علم سے استدعا کی کہ یونیورسٹی کے آخری امتحان میں کامیاب ہو کر اُن سے ملے، چند سال کے بعد اس نے یونیورسٹی کے آخری امتحان میں کامیابی حاصل کر لی، اور جوزف چیمبرلین سے جا کر ملا، اس نے اُسے اپنی جماعت میں شریک کر لیا، اور رفتہ رفتہ غریب برکن ہیڈ اس درجۂ بلندی کو پہنچ گیا، جس کی تمنا کی جا سکتی تھی، اگر برکن ہیڈ کی تعلیم و تربیت ادھوری رہ جاتی، تو اس کی ذکاوت ذہانت، قبر میں زندہ دفن ہو جاتی،

جیل خانہ اور علم | تعلیم ہی وہی واحد وسیلہ ہے، جسے بروئے کار لانے کے بعد جیل کے دروازوں پر تالا لگایا جا سکتا ہے، یہی ایک وسیلہ ہے، جس

کا سہارا لے کر فرد۔ ترقی کے انتہائی مدارج پر فائز ہو سکتا ہے، اور جماعت زیادہ سے زیادہ فروغ پذیر ہو سکتی ہے، قوموں اور ملتوں کی سربلندی کا یہی ایک راز ہے، ایک روز حضور رسالتمآبؐ باہر نکلے، آپ نے دو گروہ دیکھے، ایک گروہ وہ تھا، جو خدا کی طرف دعوت دے رہا تھا، اور اس کے راستہ کی طرف بُلا رہا تھا، اور دوسرا گروہ لوگوں کو تعلیم دے رہا تھا، آپ نے فرمایا، "پہلے گروہ کے لوگ اللہ سے مانگ رہے ہیں وہ اگر چاہے دے، نہ چاہے نہ دے۔ اور یہ دوسرا گروہ لوگوں کو تعلیم دے رہا ہے، اور میں خود معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں!" پھر آپ اس گروہ کے ساتھ بیٹھ گئے، اس طرح حضور سرورِ کائناتؐ نے ہمارے سامنے تعلیم و تربیت کی حوصلہ افزائی کی مثال پیش فرمائی، اور تعلیم کے فضل و شرف کا اعتراف فرمایا:

مروان کا مقولہ

عبدالملک بن مروان نے ایک روز اپنے بیٹوں سے کہا، "بچو! علم حاصل کرو، اگر تمھیں سرداری ملی، تو تم اور اونچے ہو جاؤ گے، اگر، طبقہ اوسط سے متعلق رہے، تو سیادت کا موقعہ تمھیں ملے گا، اور اگر تم عام آدمی کی طرح ہوئے، تو بھی اچھی زندگی گذار لو گے"!

اور مصعب بن زبیر نے ایک مرتبہ اپنے صاحب زادے سے فرمایا، "علم حاصل کرو، اگر تم بد صورت ہو، تو صاحب جمال بن

جاؤ گے، اگر تم مفلس ہو، تو مالدار ہو جاؤ گے!" اصل بات تو
یہ ہے کہ علم اس کے لئے حُسن ہے جو حُسن سے محروم ہو،
اور اس کے لئے دولت ہے جو تہی دست و نادار ہو:۔

شکسپیئر کا قول ہے۔ "علم ایسا پر پرواز ہے، جس سے کام
لے کر ہم فضائے آسمانی پر اُڑ سکتے ہیں!" ایک فرانسیسی کا
قول ہے۔ "یہ ساری دنیا ترقی کی طرف گامزن ہے، غور و فکر
کے راستے سے، اور یہ قطعاً محال ہے کہ کوئی قوم تعلیم و تعلیم
کے بغیر ترقی کر سکے، اور کوئی آدمی بھی، جہل اور پستی کے گڑھے
سے نکل نہیں سکتا، جب تک علم کی سیڑھی اس کے پاس نہ ہو!"
یہ تمدّن اور تہذیب، علم کی کثرت اور اختراع و ایجاد کی
فراوانی، اور یہ نت نئی جدّتیں، جو ہم روز دیکھتے رہتے ہیں،
تمام تر نتیجہ ہیں، تربیت اور تعلیم عامہ کا، ایسی تعلیم جو قوم
اور ملّت کے تمام طبقات میں یکساں جاری و ساری ہو:۔

جارج واشنگٹن، جو امریکہ کا نجات دہندہ، اور آزادی
دلانے والا ہے، ایک موقع پر کہتا ہے:۔

"علم ہی وہ تنہا راستہ اور مضبوط بنیاد ہے جس سے
عوام و جمہور کی اصلاح کا کام کیا جا سکتا ہے!"

آج کے دن تک ہر امریکی، جارج واشنگٹن کی اس نصیحت
پر دل و جان سے عمل کر رہا ہے، واشنگٹن نے مرنے سے پہلے

جو خطبہ دیا، اس میں اس نے کہا تھا :۔

" تمہیں سب سے پہلے ، اور سب سے بھلا جو کام کرنا چاہئے، وہ یہ ہے کہ تعلیم کو عام کردو، مدرسوں کے دروازے ہر طالب علم کے لیے کھول دو !"

کیا ان اقوال و اعمال سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی قوم اس وقت تک نہیں ترقی کر سکتی ، جب تک علم حاصل نہ کرلے۔

جمہوریہ امریکہ کے تیسرے صدر نے ایک موقع پر کہا تھا، اور کتنا سچ کہا تھا :۔

" اگر جہالت کے دور میں ، کوئی قوم آزادی حاصل کرنے کی امید کرے ، تو وہ ایک ایسے واقعہ کو رونما دیکھنا چاہتی ہے، جو کبھی بھی رونما نہیں ہوگا !"

تربیت اور تعلیم ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو رازِ خودی ، اور رمزِ خود شناسی سے آگاہ کرتی ہے ، جس سے انسان ، دوسروں کو سمجھتا ہے، اس سے فرد ، اور جماعت کو ترقی کا وسیلہ ملتا ہے ، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ تعلیم ہی اقوام و علل کی ترقی کا سبب ہے ؛

امریکہ کی مثال

امریکی ماہرین تعلیم و تربیت میں چند لوگ خاص طور پر نمایاں، اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے ، اپنے دیس میں تعلیم کو

عام کرنے ، ہر ہر فرد کو جہالت کی لعنت سے نکالنے ، اور قوم کو بہ حیثیت مجموعی خواندہ اور تعلیم یافتہ بنانے کے لئے بڑی کوشش اور جدّوجہد کی ہے ، انھوں نے چپّے چپّے پر مدرسے اور مکتب کھولے ، اور آج یہ حالت ہے ، کہ امریکہ بچوں کے لیے بوستان نغمہ وموسیقی بنا ہوا ہے ، جہاں انھیں حُبِّ وطن کی تعلیم دی جاتی ۔ ان میں وطنیت اور قومیّت کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے ، تحفّظِ حقوق کی راہ دکھائی جاتی ہے اپنی آزادی کی حفاظت کا ولولہ پیدا کیا جاتا ہے ، امریکہ کے یہ مدرسے ہی وہ تنہا وسیلہ ہیں جو وہاں کے لوگوں میں وحدت کا جذبہ پیدا کئے ہوئے ہیں ، یہی وہ ذریعہ ہے جس نے وہاں کے مختلف عناصر کو ایک بنا رکھا ہے ، ان کے اختلاف ونزاع کو ختم کردیا ہے ، ان کے اختلاف دعادات وطبائع میں توازن پیدا کیا ہے ۔ ان میں نظم وضبط کا مادہ اُبھارا ہے ، وہاں بہت سے باشندے ہیں ۔ جو اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے ہیں ۔ یا ویلز اور انگلستان کے باشندے ہیں ، یا آئرلینڈ ، فرانس ، جرمنی ، روس ، اٹلی شام کے رہنے والے ہیں ، ایسے مختلف ، متضاد ، اور متباین ، عناصر کے لوگوں میں وحدت پیدا کردینا کوئی آسان کام نہیں ہے ، لیکن ولایات متحدہ امریکہ کے مدارس کی عمومیّت نے وحدت پیدا کر دی ہے ، اور سب کو " امریکی ، بنا دیا ہے ۔ اور اُن لوگوں کے

دل میں یہ جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ ہم کہیں کے بھی رہنے والے ہوں، لیکن جس سرزمین کو ہم نے اپنا دیس بنایا ہے، اب ہم اس کے فرزند ہیں، وہی ہمارا وطن ہے، اس کے لیے ہم جئیں گے، اسی کے لیے ہم مریں گے، آج وہ صرف امریکی ہیں، امریکی کے سوا کچھ نہیں، اگر امریکہ اچھا ہے، تو وہ بھی اچھے ہیں۔ اگر امریکہ بُرا ہے تو وہ بھی بُرے ہیں، یہ وہاں کے مدرسوں ہی کا طفیل ہے، جنہوں نے جنس، دین اور طبقہ کے اختلاف کے باوجود ایک سرزمین پر انھیں ایک بنا دیا ہے، جہاں کوئی تفریق نہیں، کوئی خلیج نہیں، کوئی امتیاز نہیں۔

امریکہ کے مدارس اور مکتب

امریکی لوگوں کے دلوں میں مدارس اور مکاتب کی بڑی وقعت ہے، بڑی قدر کی نگاہ سے یہ لوگ تعلیم گاہوں کو دیکھتے ہیں، امریکنوں کا عقیدہ ہے کہ اچھی تعلیم و تربیت ہی کے بل پر امریکہ اس منزل پر پہنچ سکتا ہے کہ امریکہ ساری دنیا کی رہنمائی کرے۔ ساری دنیا کے افکار، خیالات، اختراعات، صناعات کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لے، یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ تعلیم پر وہ ہنسی خوشی بے دھڑک روپیہ خرچ کرتے ہیں، بلکہ پانی کی طرح بہاتے ہیں، ان مصارف کو وہ بوجھ نہیں سمجھتے، بلکہ اُسے ایک فرض کی طرح ادا کرتے ہیں، جو قوم اور ملت

نے ان پر عاید کرادیا ہے، وہ قوم جس پر انہیں فخر ہے، وہ ملّت جس کا نام وہ گردن اٹھا کر لیتے ہیں، اور جس کی ترقی اور فروغ کے لیے وہ ہمہ تن جدّو جہد بنے ہوئے ہیں ۔

امریکہ میں تعلیمی ٹیکس، صدقہ اور خیرات کی طرح نہیں دیا جاتا، بلکہ ایک فرض کی طرح ادا کیا جاتا ہے، کہ جس کے بغیر، قوم کی فلاح و ترقی ممکن ہی نہیں، وہ جانتے ہیں کہ قوم کی ترقی منحصر ہے صرف اچھی تربیّت اور اچھی تعلیم پر، ان کا عقیدہ ہے کہ تعلیم پر جو کچھ صرف کیا جاتا ہے وہ رائیگاں نہیں جاتا، بلکہ مع سود در سود کے واپس مل جاتا ہے۔ جاہل کا اچھا کام بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا، بلکہ ہمیشہ اُسے خطرناک قرار دیا جاتا ہے، جاہل کے ہاتھ میں اگر کوئی اچھا آلہ ہو تو وہ چھین لیا جاتا ہے، کیونکہ ہمیشہ اس کے لئے ضرورت رہتی ہے کہ کوئی ایسا آدمی ہو جو اس کی رکھوالی کرے، نگرانی کرے، برتنے کا صحیح طریقہ بتائے؛ نہ اس میں احساس ذمّہ داری ہوتا ہے، نہ وہ ضمیر کی آواز سُن پاتا ہے، اپنے جہل کے سبب وہ نہیں جان سکتا کہ اپنی فراغت کے اوقات کس طرح امور اور نافع میں صرف کرے؟ کس طرح اپنے نفس کی اصلاح کرے؟ کیونکہ مسرّت حاصل؛ کیونکہ ورزش کرے؟ ادبی کتابوں کا مطالعہ کس طرح کرے؟ مناظرے، مباحثے، اور لیکچر سے کیونکر لطف اندوز

ہو، جب وہ یہ کچھ نہیں کر پاتا۔ تو شراب کا عادی بن جاتا ہے، جُوا کھیلنے لگتا ہے، برائیوں سے اپنا دامن اُلجھا لیتا ہے۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے، یہاں تک کہ ہر جماعت اور گروہ کے لئے وہ ایک مستقل، اور دائمی خطرہ بن جاتا ہے۔

چونکہ امریکہ میں یہ نقائص نہیں ہیں، وہ علم حاصل کرنا، اور علم سے کام لینا جانتا ہے، اس لئے وہاں کارخانے کھُل رہے ہیں، فیکٹریاں قائم ہو رہی ہیں، خشک زمینوں کو سرسبز و شاداب بنایا جا رہا ہے۔ جنگلوں سے دولت کمائی جا رہی ہے، کانیں کھودی جا رہی ہیں، فارغ البالی کا دور دورہ ہے، ریلوے کی سڑکوں کا جال پھیلایا جا رہا ہے، دولت کو بڑھانے اور فائدے حاصل کرنے کے ذرائع بروئے کار لائے جا رہے ہیں، ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں سے زیادہ دولت مند ہے اس کی صناعت و زراعت سب سے آگے ہے، اس کی تجارت روز بروز بڑھ رہی ہے، غرض ترقی کا ایک دَور ہے جو قائم ہے ؛

---

(۳)

فرق و امتیاز

تعلیم اور تربیت کے درمیان

کیا تعلیم و تربیت کے مفہوم و منشا میں کچھ فرق ہے ؛ اگر ہے تو کیا ؛ نگاہِ غور سے دیکھئے ، تو معلوم ہوگا کہ تربیت اور تعلیم کے مفہوم و مطلب میں بہت بڑا فرق ہے ، تربیت سے مراد ہے ، ہر ممکن وسیلہ اور ذریعہ سے کام لے کر فرد کو تیار کرنا ، اس میں استعداد پیدا کرنا ، تاکہ وہ اپنے رجحان و میلان سے فائدہ اُٹھا سکے ، تاکہ وہ اچھی اور ٹھیک زندگی بسر کر سکے ، اور اس سماج کے لیے مفید ثابت ہو سکے جس کا وہ ایک جزو ہے ، تربیت میں ہر قسم کی تربیت شامل ہے ، تربیت وطنی ، جسمی ، خلقی وغیرہ یہ سب تعلیم و تربیت ہی کا ایک جزو ہے ، تربیت تعلیم سے عام ہے ، اس کے ذریعہ مواہب فطرت انسان کے

سامنے اُجاگر ہوتے ہیں، اور ان سے بہرہ ور ہوکر ہم منتہائے کمال تک پہنچ سکتے ہیں، ہمارا عمل منظم ہو جاتا ہے، ہماری مسرت دائمی ہوجاتی ہے۔

تربیّت دینے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچّہ کا اچھّی طرح جائزہ لے۔ اس کے وجدان، میلان، رجحان، جسم و عقل ذہن، ہر چیز کو پرکھے۔

تعلیم کا معلّم سے مطالبہ

تعلیم۔ معلّم سے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی کہ وہ تعلیم دے، تلقین کرے، جو معلومات چاہے پیش کرے، آرا اور افکار کو جس رنگ میں اور جس ڈھنگ سے چاہے سامنے رکھے۔ معلّم، کان لگا کر سُننے گا۔ سر جُھکا کر سمجھے گا، غور اور فکر سے کام لے گا، اور تربیّت میں ہر چیز کی کرید ہوتی ہے، بحث ہوتی ہے، ردّ وکد سے کام لیا جاتا ہے، اس میں اتحاد نفس ضروری ہے۔ صعوبت سے بچنے اور وسائل کے مہیّا کرنے کی ہمّت سے کام لیا جاتا ہے، تعلیم میں سمع و طاعت سے کام لیا جاتا ہے۔ تربیّت میں غور و فکر سے بچّہ، تربیت کے دور میں سوچتا ہے، تعلیم کے دور میں رٹتا ہے، تعلیم، تربیّت عقلی کا جزو ہے، اس کا مقصد ہے، معرفۃ کا حصول، مہارت کا ادراک، اور روایت کی پرکھ

اور تربیت شخص اور فرد کو، علمی اور عملی زندگی کے لیے تیار کرتی ہے، اس کے جسم و عقل میں جلا اور روح پیدا کرتی ہے۔ اس کے اعصاب اور عضلات میں قوت اور توانائی پیدا کرتی ہے۔ اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ تعلیم و تربیت میں کافی فرق ہے، مدرسین سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ صرف سبق نہ دیں نتائج بھی دیکھیں، وہ لڑکے کے سامنے، جو مواد پیش کریں، وہ کامل ہو کافی ہو، شافی ہو، ہم تعلیم کے اتنے محتاج نہیں ہیں، جتنے تربیت کے۔

مدرّس کی کوتاہی

آج کل کے دَور میں، یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مدرّس اپنی ترقی اور طالب علم کے امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک بدن کی، جسم کی، عقل کی، روح کی، ذہن کی، دماغ و اخلاق کی تربیت کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی، وطنی تربیت کو بھی وہ ہیچ سمجھتا ہے، اور عمل کی اہمیت کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتا۔ وہ صنعتی، زرعی، تجارتی اور فنی تربیت کو بھی ضروری نہیں سمجھتا۔

نظامِ تعلیم میں ہم جو اصلاح چاہتے ہیں، وہ صرف یہ ہے کہ معلم، مربّی بن جائے، وہ تربیت کا کوئی گوشہ تشنۂ توجہ نہ چھوڑے۔ اگر ہم یہ مقصد حاصل کرلیں، تو ہم اس منزل تک

پہنچ جائیں گے، جہاں تک ہم پہنچنا چاہتے ہیں، ہماری ابتدائی اور ثانوی تعلیم ایک اچھے معیار کی حامل ہو جائے گی۔ پھر تعلیم مفید ہوگی، اور ثمر بخش، اور ہم وہ زندگی بسر کر سکیں گے۔ جو کسی کا بھی منتہائے نظر ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ ہم اور کچھ نہیں چاہتے ؂

---

(۴)

صحیح اور موزوں تربیت

اثرات ــــــ و ــــــ نتائج

بچپن کی تربیت جوانی اور بڑھاپے تک قائم رہتی ہے، اسی لئے معلمین کے لیے یہ ضروری ہے کہ بچہ کی تربیت پر وہ خاص طور پر زور دیں اور اس کی اہمیت کسی قیمت پر بھی نظرانداز نہ ہونے دیں، اور یہ تربیت بہت صحیح اور موزوں اصول پر ہو۔ اگر صحیح اور موزوں اصول پر ہوئی تو بڑھاپے تک کام دے گی۔ عادت طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے، اور صحیح تربیت کی نشانی یہی ہے۔ کہ جو کچھ سکھایا یا بتایا جائے، وہ طبیعتِ ثانیہ بن جائے۔ تربیت صحیحہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ معلم پند و موعظت میں کمی نہ کرے، اور متعلم سیکھنے اور سمجھنے میں بخل سے کام نہ لے، یہاں تک کہ وہ ان اقدار کا حامل ہوجائے، جو ایک مکمل انسان کے لئے ضروری ہیں۔ مدرس کے

لیے ازبس ضروری ہے کہ وہ صرف تعلیم ہی کی اہمیت نہ محسوس کرے، بلکہ تعلیم سے کہیں زیادہ تربیت کو اہمیت دے، تربیت سے مراد عقل، حواس، ارادہ، جسم، ذاتی وجدان، ہر چیز کی تربیت ہے۔

علم و عمل

ہم ایک علم حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ ہم نے حاصل کر لیا، صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے ضروری ہے۔ کہ علم کو ہم اپنے عمل سے ثابت کریں، یہی تربیت ہے، مدرس کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلبا میں اخلاق، عاداتِ صالحہ اور فکر و نظر کی گہرائی رچادے۔ تعلیم و تربیت کے ماہرین ہمیشہ اس اصول پر زور دیتے رہے ہیں، چنانچہ اس موقع پر کومینوس کا وہ اصول خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جو اس نے فلسفہ تعلیم و تربیت میں ممتاز طور پر داخل کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ موسیقی اور نقاشی بھی، تربیت عقلی و حسی کے لئے بہت ضروری ہے۔ روسو کا قول ہے کہ بچّہ کے پہلے معلّم اس کے پاؤں ہاتھ اور آنکھیں ہیں۔ پیتالوزی کا خیال ہے کہ علم کے ساتھ اگر عمل نہ ہو تو وہ بیکار محض ہے، آخر اس سے کیا فائدہ کہ معلّم نے حفظانِ صحت، ریاضی، زبان اور دوسرے فنون کے قواعد و ضوابط معلوم کر لیے۔ لیکن ان پر عمل نہ کر سکا؛ آنکھ کو محفوظ رکھنے کا اصول معلوم کر لیا جائے، مگر اس کی حفاظت نہ کی جا سکے تو اس سے فائدہ؛ پاکی اور پاکیزگی پر اگر ایک گندہ آدمی ایک اچھی سی، تقریر کر ڈالے تو اسے کون توجہ اور

دلچسپی سے سُنے گا؛ صرف و نحو، فصاحت و بلاغت کے تمام اصول زبانی یاد کر لیے جائیں، لیکن لب و لہجہ غلط ہو، گرامر غلط ہو، ترکیبیں غلط ہوں، لکھنے کی اہلیت نہ ہو، سمجھنے کا مادہ نہ ہو، صحیح زبان استعمال کرنے کا ملکہ نہ ہو، تو حاصل؛ ضرب، تقسیم اور جمع تفریق کا اصول معلوم ہونے کے باوجود، اگر آدمی یہ نہ بتا سکے کہ اس نے اگر ایک دوکان دار سے دس آنے کی چیز ایک روپیہ دے کر خریدی، تو تو اب اس کے پاس کیا بچا؛ تو اس سے کیا حاصل؛

شاگرد اور اُستاد

فروبل نے تربیت و تعلیم کے لیے لازمی قرار دیا ہے کہ شاگرد کے ساتھ اُستاد کو. تعلیم و تلقین کے علاوہ ذاتی طور پر بھی اس کے کردار و عمل سے دلچسپی لینا چاہیے، اور اس کے پاس جو کچھ ہے وہ شاگرد کے سینہ بہ سینہ [illegible] دینا چاہیے۔ امریکہ کے ایک مشہور ماہر تعلیم و تربیت کا بیان ہے کہ ناکارہ تربیت خطرناک ہے، مدارس میں سبق رٹانے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ اور پڑھانے والے بک بک کے سوا کچھ نہیں جانتے، اور بسیار گوئی کا شمار تعلیم میں نہیں کیا جا سکتا. [illegible] کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ بتا دے اور اُسے کافی سمجھے بلکہ یہ دیکھے اس نے جو کچھ بتایا، وہ سکھایا بھی ہے یا نہیں؛ معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ مربی بن جائے اور تربیت کو آلہ کار بنا کر تعلیم دے۔

تربیت کے صحیح اصول کو اگر ہم پیش نظر رکھیں تو جغرافیہ کے معلم کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ کتابوں اور تصویروں سے جغرافیہ کی تعلیم دے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ انھیں ہر چیز کی حقیقت سے روشناس کردے۔ انھیں نہروں اور گھاٹیوں، سمندروں اور میدانوں دریاؤں اور وادیوں کے ساتھ ساتھ قوموں اور ملتوں اور ملکوں کی ماہیت و فوائد بھی بتائے۔ اسی طرح حساب کے ماسٹر کے لئے صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ وہ عام ضروریات کے قاعدے یاد کرا دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ انھیں اس طرح برتنا سکھائے کہ وہ روز مرہ کی زندگی میں کام دے سکیں۔ اسی طرح زبان کے معلم کو صرف اس پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اصطلاحیں اور ان کی تعریفیں رٹا دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی بار بار مشق کرائے، نئی نئی مثالیں دے، بار بار تطبیق دے، یہاں تک کہ وہ قواعد اور اصول، ذہن میں رچ جائیں، اور پڑھنے میں لکھنے میں بات چیت میں مددگار ثابت ہوں۔

ہم، یہ نہیں معلوم کرنا چاہتے کہ طالب علم نے کتنا یاد کرلیا بلکہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں اپنے علم کو بروئے کار لانے کی استطاعت کتنی پیدا ہوئی؟ کیا وہ اچھی بات پرکھ لیتا ہے؟ کیا وہ معاملہ میں اچھا ہے؟ کیا اُسے اپنی صحت کا خیال ہے؟ کیا وہ تکلیفوں کو خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کرسکتا ہے؟ کیا وہ

اطاعت مند اور صالح ہے ؛ کیا وہ اپنے فرائض کو خوبی وخوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے ؛ وہ فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی تو نہیں کرتا، وہ جُرم اور گناہ کی طرف راغب تو نہیں ہے ؛

تربیتِ صحیحہ

تربیتِ صحیحہ کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ علم کے ساتھ عمل کی قدرت بھی حاصل ہو جائے، بصارت کے ساتھ بصیرت بھی کام کرتی ہو ، دُور اندیشی کا جوہر بھی کارفرما ہو ، نیک اور پاکیزہ عادتیں بھی جزو زندگی بن چکی ہوں ، اخلاق وکردار میں استحکام اور قوت ہو ، خوشی اور غم میں بے قابو نہ ہو جاتا ہو ، امانت اور اعتمادِ نفس کا حوصلہ بھی ہو ، صحت کی فکر ہو ، معقول بات کو مان لینے کی عادت ہو ، ضمیر کی رہنمائی میں چلنے کی سکت ہو صرف اسی طرح معلم اپنے علم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ، اور اپنی زندگی سنوار سکتا ہے ، صرف اسی طرح ، تجربات ، نظریات اور حقائق علمی سے وہ بہرہ وَر ہو سکتا ہے ۔

تربیت کے مبادیات

تربیتِ صحیحہ کے لیے ضروری ہے کہ :-

(۱) حدکمال تک پہنچنے کی عملی جدوجہد۔

(۲) مواہب خطرہ سے انتفاع ، جو بچہ ہر آن اور ہر گھڑی دیکھتا رہتا ہے ، ان کی دل میں اُتر جانے والی توجیہہ ، کیونکہ اگر توجیہہ کمزور ہوئی ، تو وہ متعلم کے دل میں نہیں بیٹھے گی ، اور اس کی طبیعت اُچٹ جائے گی ۔

(۳) ذہین اور ہوش مند طلبہ کی حوصلہ افزائی ؛

(۴) حواس، عقل، جسم، وجدان ؛

(۵) متعلّم کی ذات سے دلچسپی، یعنی پڑھانے سے نہیں سکھانے سے بھی واسطہ رکھنا ؛

(۶) متعلّم کو مشق و مہارت اور غور و فکر کے لیے کافی وقت دینا، تاکہ اطمینان سے وہ اپنے ذہن و دماغ میں پڑھی ہوئی اور سیکھی ہوئی چیزیں راسخ کر سکے ؛

معلّم کو یہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے، کہ وہ ہر روز وقت مقررہ پر پند و نصیحت کا دفتر کھول کر نہ بیٹھ جائے، بلکہ طلبا کے سامنے بتائی ہوئی چیزوں کی مثالیں پیش کرے کہ علم سے اتنا احساس نہیں پیدا ہوتا، جتنا نمونہ اور مثال کو دیکھنے کے بعد پیدا ہوتا ہے اگر ہم، یہ کہیں تو ذرا بھی مبالغہ نہیں کریں گے کہ تربیّت عمل کا دوسرا نام ہے، اسی طرح تلامذہ کے دل میں اُبھرنے اور بڑھنے کا مادہ پیدا کیا جا سکتا ہے، یاد رکھنا چاہیے، کہ عمل، علم سے تیز ہوتا ہے، اور علم بغیر عمل کے ہیچ ہے۔ ؛

---

(۵)

تربیت صحیحہ

وسائل و ذرائع

موجودہ زمانہ میں ترقی یافتہ قومیں تعلیم و تربیت کو اتنی اہمیت دیتی ہیں کہ تاریخ عالم کے کسی دور میں اس کی مثال نہیں ملتی، وقت کے اہم ترین مسائل میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہی ہے کہ صرف اسی مقصد کے حصول پر، ملک و قوم کی فارغ البالی اور ترقی منحصر ہے، آج کے بچے کل قوم بنیں گے، اور ضرورت ہے کہ انھیں پائندہ تر اور مضبوط تر بنانے کے لیے، ان کی تربیت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے، کوئی بھی لیڈر اور راہنما اس مسئلہ سے غفلت نہیں کر سکتا، بشرطیکہ وہ اخلاص کے ساتھ اپنی قوم اور ملت کو سربلند کرنا چاہتا ہو، ترقی یافتہ اور اونچی قوموں کا ہر فرد، اس احساس سے بھرپور ہے، باپ کو یہ فکر ہوتی ہے کہ

بیٹی کو زیادہ سے زیادہ جوہر تربیت سے نوازے، معلم یہ چاہتا ہے کہ متعلم خوب سے خوب تر ہو جائے۔ ماں کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اس کا بیٹا یا بیٹی، زیور علم و تربیت سے محروم نہ رہنے پائے، اور یہ لوگ ہر امکانی ذریعہ، اور وسیلہ اختیار کر کے اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص مدرسہ اور تعلیم کے بارے میں فکرمند ہے، اس مسئلہ پر بحث کرنے سے کوئی بھی نہیں چوکے گا، معلمین خاص طور پر اس فکر کے شکار ہیں، تعلیم و تربیت کے اصول طرز اور طریقے میں، تو اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن نفس و تربیت تعلیم کے بارے میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے، اس لیے کہ اطفال کی تربیت، دوسرے لفظوں میں پوری قوم کی تربیت ہے۔

وسائل تربیت

وسائل تربیت میں، باپ اور مدرس کا عمل ہی کام نہیں کرتا، بلکہ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جو ذہن و دماغ اور اخلاق و کردار پر اثر انداز ہوتی ہیں، جو اِن کے حدودِ اختیار سے باہر ہیں۔ مثلاً موثرات طبیعہ، یہ موثرات طبیعت پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں،

روسو کا قول ہے کہ انسان، اپنے آبا و اجداد سے جو کچھ وراثتہً حاصل کرتا ہے، علم، تجربہ، اور اطلاع سے جو کچھ پاتا ہے، اپنے عمل کے دوران میں جو کچھ محسوس کرتا ہے۔ ممالک غیر کا سفر

کر کے جو کچھ دیکھتا، پاتا، جانتا، اور سیکھتا ہے، اپنی ذات کے علاوہ دوسرے لوگوں، خاص کر دوستوں، اور رفیقوں کے ساتھ رہ کر، مل کر حاصل کرتا ہے۔ عادت، نظم و ضبط، اور قوانین کے مطالعہ سے جو کچھ سیکھتا ہے، جماعتوں اور گروہوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کر کے جو کچھ دیکھتا، اور پاتا ہے، یہ سب تربیّت نفس اور تربیّت ذات کے بہترین وسائل ہیں۔ انسان کی سیرت اور کردار پر ان کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے، اور تربیّت کا جو مقصد ہے، وہ بڑی حد تک ان مشاہدات سے حاصل ہو جاتا ہے ⁂

تربیّت کے بہت سے وسائل و ذرائع ہیں، لیکن ان سے انسان یک بیک دوچار نہیں ہوتا، رفتہ رفتہ عمر اور وقت کے مختلف مرحلوں میں دوچار ہوتا ہے اور فائدہ اُٹھاتا ہے، یہاں تک کہ وہ درجۂ کمال تک پہنچ جاتا ہے ⁂

فروبل کا قول ہے کہ تربیّت صحیحہ، انسان کی رہنمائی کرتی ہے اسے صحیح راستہ دکھاتی ہے، اسے معرفت نفس کا درس دیتی ہے اسے تقدیر طبیعی سے آشنا کرتی ہے، اللہ کی وحدت پر اس کا اعتقاد مستحکم کرتی ہے اور انسان کو اونچے درجہ تک پہنچا دیتی ہے۔

تربیّت اور زندگی

تربیّت کی وہی حیثیت ہے جو خود انسان کی زندگی ہے، تربیت کا کام،

بچّہ کی ولادت کے وقت سے شروع ہوجاتا ہے ، بلکہ ولادت سے پہلے ہی تربیّت کے عوامل کام کرنے لگتے ہیں ، اور ولادت کے قبل ہی بچہ پہ ہر لمحہ ، تربیت کا فلسفہ ، بچّہ کی نشو و نما ، اخلاق و عادات اور سیرت و کردار پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے ، بچّہ کا دماغ اور اعضاء اور قویٰ ، یہ سب چیزیں اسے اپنے آباو اجداد سے ورثہ میں ملتی ہیں ، اور تربیّت دینے والا پھر انھیں سنوارتا اور نکھارتا ہے ، اس کی مثال بالکل طبیب کی سی ہے ، طبیب کسی کو زندگی بخش نہیں سکتا ، کسی کی زندگی بڑھا نہیں سکتا (غلط طبیب زندگی کو کم ، اور ختم ضرور کرسکتا ہے ۔ لیکن وہ ایسا گرُ ضرور بتا سکتا ہے ، اور ایسا علاج ضرور کرسکتا ہے ، جس سے طبیعت بیمار نہ ہو ، اور بیماری کا اثر نہ قبول کرلے ، انسان صحت مند اور توانا رہے ، ماں یہ تو چاہتی ہے کہ خانگی مصروفیات کے باوجود بچہ کی تعلیم پہ زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرے ، لیکن وہ یاد نہیں رکھتی کہ بچّہ کے ساتھ اس کا رکھ رکھاؤ محبت شفقت ، پیار ، غصہ ، نفرت ، چومنا ، چاٹنا ، مارنا ، پیٹنا ، ان سب چیزوں کا براہ راست لیکن بالکل غیر شعوری طور پہ بچّہ کی تربیّت پہ اثر پڑتا ہے ، وہ تربیّت ، جو بچہ ماں کی گود میں حاصل کرتا ہے بچّہ کی ساخت اور پرورش ، تقویم اور تہذیب بن جاتی ہے ، اور اس سے وہ صحت حاصل کرتا ہے ۔ مسرّت حاصل کرتا ہے ، اور درجۂ کمال تک پہنچتا ہے ۔

---

(۶)

تربیت جدیدہ

رہنمائی ـــــ نگرانی ـــــ نصیحت

عہدِ جدید میں تربیت کا مفہوم یہ ہے کہ اطفال کی رہنمائی کی جائے، ان کے ساتھ گھل مل کر رہا جائے، بات چیت اور ہنسی مذاق میں انھیں صحیح راستہ دکھایا جائے، ان کے ساتھ جبر نہ کیا جائے، تعاون کیا جائے، تاکہ آباد اجداد سے جو کچھ انھیں وراثت میں ملا ہے وہ صحیح طور پر بڑا ہے، اور جب بھی وہ بھٹکے ہوئے نظر آئیں، خوبی و خوش اسلوبی سے انھیں صحیح راستہ پر ڈالا جائے۔ ان کے قویٰ کو ایسے سانچے میں ڈھالا جائے کہ قوی بن سکیں اور کام کے آدمی بن جائیں۔ نصیحت اور پند کا مقصد، تلمیذ کی امداد ہو، کہ وہ خود، خوب و زشت میں تمیز کر سکے، بس اس سے زیادہ کچھ نہیں، اسے حکم نہ دیا جائے۔ حقیقت کھول کر رکھ دی جائے، اس پر جبر نہ کیا جائے، زور نہ دیا

جائے، اب وہ خود ہی نپٹ لے گا۔ غلط سے ہٹ جائے گا۔ اور صحیح پر آجائے گا:

شرکت و تعاون

لڑکے اپنے کاموں میں دوسروں کی شرکت جویا رہتے ہیں، استاد کے لیے مناسب ہے کہ کھیل کود میں ان کا ساتھ دے۔ ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹائے ان کی مدد اس طرح کرے کہ وہ محسوس نہ کر سکیں، ان کے ارادہ اور اُمنگ پر وہ پہرہ دار تو بن جائے، لیکن روگ نہ بنے، ان کے ساتھ ایسا برتاؤ رکھا جائے کہ وہ خود ہی اپنا کام کریں، غلطی کریں، مضائقہ نہیں، خود ہی اُسے محسوس کر لیں گے، اور رہنما کی طرف ہاتھ اپنی مرضی سے بڑھائیں گے۔ اپنے مُنہ سے مدد مانگیں گے، اب وقت ہے کہ آپ ان کے امور میں مداخلت کریں۔ اس مداخلت کو وہ شکریہ کے ساتھ قبول کریں گے، اور آپ کو ممنون نگاہوں سے دیکھیں گے۔

نئے زمانہ کی تربیت یہ چاہتی ہے کہ اُستاد، شاگرد کی اسی وقت مدد کرے، جب وہ خود چاہے، ایسا ہوتا ہے کہ لڑکا کھیل میں دشواری محسوس کرتا ہے، جو کرنا چاہئے وہ نہیں کر پاتا، جو نہ کرنا چاہئے وہ کر گزرتا ہے۔ اب وہ اپنی غلطی سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہو پاتا، اُستاد کے لیے اب وقت ہے کہ ہمدردی کے ساتھ غلطی ٹھیک کر دے لیکن اس طرح کہ وہ خود بھی، محسوس کر لے کہ غلطی

کیا تھی - اور ٹھیک کیا ہے ؛ فرض کیجئے حساب کا کوئی سوال ہے، وہ آپ کی طرف امداد طلب نگاہ سے دیکھتا ہے، آپ کیا کریں گے ؟ کیا مدد کرنے بیٹھ جائیں گے ؛ نہیں اسے کرنے دیجئے، اُسے غلطی کرنے دیجئے، اپنا کام وہ خود کرے، اگرچہ غلطی کیوں نہ کر گذرے، جب وہ غلطی کر چکے، تو آپ شوق سے اس کی مدد کیجئے، مشق کرائیے، بالکل راہِ راست پر لے آئیے، اب وہ آپ کی مدد کی قدر کرے گا، شاگرد میں اعتمادِ نفس پیدا کیجئے، وہ خود اپنے اوپر بھروسہ کرنا سیکھے، اس کی رہنمائی اس طرح ہونی چاہئے کہ فائدہ کی بجائے اُسے نقصان نہ پہنچے، لڑکا تو یہ چاہتا ہے کہ آپ اس کی مدد کریں لیکن وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ آپ اس کی جگہ لے لیں، اور اس کا کام آپ اپنے ہاتھوں انجام دے دیں، وہ اس وقت بڑا خوش ہوتا ہے، جب دیکھتا ہے، یہ سوال وہ خود حل کر سکتا ہے، اس کی مدد صرف اس وقت کیجئے، جب وہ یہ محسوس کرلے کہ یہ کام اس کی طاقت سے زیادہ ہے۔

تربیت اور تربیت دہندہ

تربیت کے لئے تربیت دہندہ ضروری ہے، اگر مقدمات درست ہوں گے، تو نتائج بھی ٹھیک ہوں گے، اگر مقدمات نا درست ہوں گے، تو نتائج بھی ٹھیک ہوں گے، اگر تربیت صحیح ہے۔ تو اس کا نتیجہ بھی اچھا نکلے گا، اگر غلط ہے تو اس کا نتیجہ کبھی بھی اچھا نہیں بر آمد ہو سکتا، اگر کوئی قوم یہ چاہتی ہے کہ اس کی

حالت سدھرے، اس کے تاجر، ملازم، حکمران طبقہ کے لوگ اچھے ہوں تو ضروری ہے کہ وہ تربیت پر خاص زور دے، مدرسین اور مدرس کی طرف خاص توجہ کرے، تربیت اور تعلیم کے اصولوں کو دیکھے، پرکھے، جانچے، اور جلد سے جلد انھیں بروئے کار لائے۔

ہم ایک مثال دیتے ہیں، یوں سمجھئے، ایک شخص ہے جو سائیکل چلانا سیکھنا چاہتا ہے، ایک دوسرا ہے، جو اچھی طرح چلانا جانتا ہے، وہ پہلے آدمی کی اس طرح مدد کر سکتا ہے کہ اُسے ہینڈل گھمانا، اور اس کے استعمال کا صحیح طریقہ بتا دے، اور سائیکل کا رخ اس طرف کر دے، جدھر وہ جانا چاہتا ہے، لیکن چلائے گا وہی جو سیکھ رہا ہے، بار بار مشق کرے گا، گرے گا، اور پھر چڑھے گا، تو وہ ایک اچھا سائیکلس بن جائے گا، سائیکل چلانا اُسے کس طرح آیا؟ صحیح رہنمائی سے، صحیح تربیت ہے:۔

رہنمائی کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں، اس نقطۂ نظر کا تعین، جو مقصود و مطلوب ہے، اور اس عمل کی ایسی تربیت، جو مقصود و مطلوب کے حصول میں مددگار ہو، ان دو اصولوں کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہئے، اس لیے کہ طفل نو آموز ایک بڑا قیمتی جوہر ہے اُسے ہر غلطی اور غلط روی سے بچانے کے لیے پوری کوشش کرنی چاہئے، اس لیے کہ قوم عبارت ہوتی ہے افراد سے، اور افراد کی رہنمائی ہے:۔

دانش مندانہ رہنمائی، اور اچھے اور قابل تقلید عمل کا نمونہ،
سبق آموز نصیحتیں، بچّہ کی تربیت میں بہت کام آتی ہیں، اس میں
اچھی عادتیں پیدا کرتی ہیں، عمل کا نتیجہ دیکھنے کی خواہش پیدا کرتی
ہیں، نتائج کو پرکھنے کی استعداد پیدا کرتی ہیں، صلہ اور انعام کی
تمنا کے بغیر فرض کو ادا کرنے، اور نیک کام کرنے کی صلاحیت پیدا
کرتی ہیں، وہ اپنے ہر کام میں اللہ کو دخیل پاتا ہے۔ اور اس
طرح خود اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے ؛

تلمیذ و مکتب

جب لڑکے مدرسے جاتے ہیں تو مدرسے
میں پہنچنے سے پہلے انھوں نے جو معلومات
اور کیفیات حاصل کئے تھے انھیں بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں،
وہ مدرسے میں کچے پھل کی طرح آتے ہیں، انھیں پکانا یا بگاڑنا
ہمارا کام ہے، اگر ان کی سمجھ کے مطابق ان سے باتیں کی گئیں،
استعداد کے مطابق کام لیا گیا، کام کی مشق کرائی گئی، تجربہ سے
ان کی مدد کی گئی، نرمی اور محبت کا برتاؤ کیا گیا، کہانی، کہانی اور
قصے، قصّے میں انھیں کام کی باتیں بتائی گئیں، تو وہ بگڑنے نہیں
پائیں گے، بچّوں کی فطرت اور حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنے سے
زیادہ دوسرے لوگوں سے دلچسپی لیتے ہیں، اعمال میں، اعتقاد میں،
حرکات میں، سکنات میں، فکر و نظر میں، اغراض و مقاصد میں، وہ
دوسروں کو دیکھ کر ویسا ہی بننا چاہتے ہیں۔ ان کے سامنے جو نمونہ

ہوگا، اسی کی تقلید کریں گے، اب یہ معلّم کا کام ہے کہ وہ تقلید کیسی ہو؛ طوطے اور بندر کی سی، یا فکر و دانش کے اثرات کے ماتحت؟

موجودہ زمانہ کی تربیّت، جزِ مجرد نہیں ہے کہ ایک بات بتا دی، اور وہ کافی ہوگئی، ایک سبق پڑھا دیا اور اُسے یاد کرا دیا۔ آج کل عملی اور زندہ تربیت دیکھی جاتی ہے، جو شاگرد میں، آزادی فکر، اعتمادِ نفس، اور جدّ و جہد کا جذبہ پیدا کرے، پس ضروری ہے کہ آج کا مدرسہ خارجی زندگی کا کلچر ہاؤس بن جائے۔ جس میں زندگی کا ہر گوشہ اُجاگر اور روشن ہو، وہ زندگی سے دُور نہ ہو، قریب ہو، بلکہ یکسر زندگی ہو، مدرّس کا فرض ہے کہ وہ تلمیذ کو انسانِ کامل بنا دے، جس کا بدن مضبوط ہو، فکر مستحکم ہو، ارادہ قوی، شخصیت دلآویز ہو، جو وطن کا دوست ہو! کام کا ماہر ہو، زبان و قلم سے قوم کی خدمت کر سکتا ہو، دوسروں کے ساتھ اشتراک و تعاون کی زندگی بسر کر سکتا ہو، وہ آنکھوں سے دیکھتا ہو، اپنے کانوں سے سُنتا ہو۔

---

(۷)

تربیت
ایک اہم اجتماعی فرض

جماعت افراد سے مرکبّ ہوتی ہے، یہ ایک دوسرے سے مربوط، افراد جماعت بن جاتے ہیں، اور یہ جماعت کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے عالمِ وجود میں آتی ہے، اور پھر بہت سی جماعتیں مختلف اغراض و مقاصد، مختلف مفاد اور نقطہ نظر کو لے کر نمودار ہوتی ہیں۔ اور اُن کا مجموعہ قوم یا حکومت کہلاتا ہے۔

ان تمام جماعتوں میں سے ہر جماعت، اپنے ممبروں اور ماننے والوں پر ایک خاص اثر رکھتی ہے، جیل خانہ کے قیدی بھی جماعت بنا کر زندہ رہتے ہیں، اور چوروں کا گروہ بھی جماعت کی شکل میں قائم ہوتا ہے، طبیب، ڈاکٹر، معلّم کھلاڑی، سب جماعتیں ترتیب

دینی ہیں، اور ہر جماعت کے افراد پر، جماعت کا رنگ غالب ہوتا ہے، اور یہ رنگ عادت، اخلاق، سیرت، کردار غرض زندگی کے ہر شعبہ پر غالب ہوتا ہے۔

جماعت اور فرد

جماعتوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا، کہ ان کے افراد سب کے سب ایک ہی ساتھ رہتے ہوں، یا ایک ہی جگہ پر مجتمع ہوں، مذہبی، فنی، علمی، ادبی، طبی مختلف اقسام و انواع کی جماعتیں ہیں، جن کے افراد ہر گوشۂ عالم میں بکھرے ہوئے ہیں، بایں ہمہ جماعت کے ہر فرد، جماعت کا تابعدار اور خیر سگال ہے، جماعت کے ان افراد کے درمیان ربط و تعلق مل جل کر رہنے سے نہیں، خیالات و نظریات سے ہے اور ان کی تبلیغ اخبارات و رسائل، اور کتابوں کے ذریعہ برابر ہوتی رہتی ہے، بحث و اختراع، فکر و نظر، تجربہ اور مشاہدہ کے نئے نئے گوشے کھلتے ہیں اور اس طرح جماعت کا ہر فرد خواہ وہ کتنے ہی دُور دراز مقام پر کیوں نہ ہو، اپنی جماعت کی سرگرمیوں سے واقف رہتا ہے، اور جماعت سے اپنا تعلق پوری مضبوطی اور استواری کے ساتھ قائم رکھتا ہے فکر و نظر کی ترقی کا یہ سب سے بڑا عمل ہے، جو برابر کام کر رہا ہے۔

اجتماعیت اور جماعتی زندگی کا سب سے بڑا اور مؤثر عمل، صرف تربیت ہے، لیکن یہ تربیت عہد طفلی سے ہونا چاہیے،

اور وہ بھی اجتماعی طور پر، تربیت ماضی پر مبنی ہوتی ہے، اور مستقبل کو حسین بناتی ہے، سچ پوچھئے تو انسان کو سنوارنے اور بنانے، اس کی اجتماعی، زندگی کو رو براہ کرنے، اور اس کی اجتماعی، زندگی کو ترقی سے روشناس کرنے کی تمامتر ذمہ داری تربیت ہی پر ہے، تربیت ہی ایک وحشی کو مہذب بنا سکتی ہے۔ جہل کی تاریکی سے نور کی روشنی تک پہنچا دیتی ہے۔ تنگ و تاریک کوٹھری سے نکال کر، وسیع اور فراخ، اور روشن میدان میں لا کھڑا کرتی ہے۔ یعنی فکر و اختراع کا میدان :

اجتماعی موثرات

وہ عوامل جو بچہ کے قویٰ اور مزاج اور میلان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کیا ہیں؟ گھر جہاں وہ رہتا ہے، مدرسہ، جہاں وہ پڑھتا ہے، فیلڈ جہاں وہ کھیلتا ہے، سوسائٹی جہاں وہ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ بس وہ اجتماعی ماحول ہی جس میں انسان رہتا اور بستا ہے، انسان کی رہنمائی کر کے اُسے بینا یا اندھا بنا سکتا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ دیکھنے لگے، اور ہو سکتا ہے کہ اُسے کچھ نظر نہ آئے، یہ ماحول ہی انسان کو مخصوص عقائد کا پرستار اور مخصوص عقائد سے بیزار بنا دیتا ہے، اور اس طرح اس کے کردار اور مزاج میں کچھ ایسی چیزیں راسخ ہو جاتی ہیں جو اس کے عادات، معاملات، عمل، نظام، حیات، گفتگو، سیرت، نفس، ذات، اس چیز پر چھا جاتی ہیں، پھر اس میں اتنی پرکھ پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جان لے، کہ دوسروں کے

ساتھ کس طرح معاملہ کیا جاتا ہے، اپنے معاملا کیونکہ سلجھائے جاتے ہیں'
وہ کام کس طرح کیا جائے جو کامیابی کا ضامن ہو؛

اس ماحول میں ہر وہ چیز آجاتی ہے، جس سے انسان کو اور
اس کے امیال و مواظف کو ذرا بھی تعلّق ہو، بلکہ درحقیقت یہ انسانی
زندگی کا سہارا بن جاتا ہے، آثار قدیمہ کے ایک محقق کے لیے
کھنڈرات ہی اس کا ماحول ہیں، جن میں سے چُن چُن کر وہ گزرے
ہوئے لوگوں کے نقوش ڈھونڈتا ہے۔ ہیئت دان کے لیے اس کی
دوربین اس کا ماحول ہے، جس سے وہ ستاروں کی حرکت اور
طلوع و غروب کے مناظر دیکھتا ہے، مچھلی کے لیے پانی اس کا
ماحول ہے، جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی ایک مہم باز کے
قطب نمائی سب کچھ ہے، خواہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو یا
ناکام، ماحول اس جگہ اس اصطلاح کے مفہوم میں استعمال کیا گیا
ہے، جو ان تمام شروط پر حاوی ہے۔ جو دنیا کی زندگی اور ترقی
میں مددگار ثابت ہوتی ہے، جو انسان کو ایک کام کی ترغیب دیتی
یا اس سے روکتی ہیں، جو انسان میں چند مخصوص خصائل پیدا کرتی
ہیں، اور چند مخصوص خصائل سے اسے محروم کر دیتی ہیں ؛

اجتماعیت! پھر جبکہ انسان تن تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا
بلکہ دوسروں کی رفاقت ناگزیر ہے تو ضروری
ہے کہ وہ اجتماعیت کو فروغ دینے کے وسائل بروئے کار لائے،

جو اس اجتماعیت کے اجزا ــــ افراد ــــ کو ایک دوسرے کو اور زیادہ قریب کردیں، مثلاً مصر کے اُستاد، انگلستان، امریکہ، جرمنی اور جاپان کے اساتذہ کی ہر بات میں پیروی نہیں کریں گے، اس لیے کہ ان کا نظریہ اپنا ہے، جُدا ہے، الگ ہے، وہ ایسا نقطۂ نظر تلاش کریں گے، جو بحیثیت مجموعی ملّت مصری کے لئے مفید اور سازگار ہو، وہاں اگر تعلیم کی تحریک اٹھتی ہے، تو وہ کسی خاص جماعت کے لیے نہیں، سارے مصر کے لیے، پوری ملّت مصری کے لیے، انگلستان بھی اسی دَور سے ۱۸۷۰ء تک گزرتا رہا ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسروں کی اچھی باتیں بھی نہ لی جائیں، ضرور لی جائیں، لیکن وہی جو اپنے ماحول سے مطابقت رکھتی ہوں، جن کا تجربہ دنیا کی قومیں کرچکی ہیں، اور کامیاب ہوچکی ہیں، تجارت سے فائدہ اُٹھانا ہر شخص کا حق ہے۔

ماحول اور سوسائٹی کا اثر بڑا دُور رس اور دیرپا ہوتا ہے، قدم قدم پر انسان کی خارجی زندگی، اور اجتماعی عادات میں دیکھ لے، حیوان تک، مثلاً کُتا، گھوڑا، بندر، ماحول اور سوسائٹی سے متاثر ہوتے ہیں، پھر انسان کہاں تک نہ ہوگا؟ وہ تو خاص طور پر اپنے ماحول اور سوسائٹی سے متاثر ہوتا ہے، ہمارے اس قول کا اگر ثبوت چاہیئے، تو کسی قوم پر نظر ڈالیے، جو آزاد ہو، اس کی فضا آزادیٔ تنقید، اور آزادیٔ خیال سے لبریز ہوگی، اس سے

برعکس جو قوم غلام ہو، اس پر ایک نظر ڈالیے، وہاں آزادی کچلی جاتی ہے، نکتہ چینی کا احترام نہیں کیا جاتا، اخبارات بند کر دئے جاتے ہیں، کتابیں ضبط کر لی جاتی ہیں، زبان بند کر دی جاتی ہے، مُنہ پر تالے لگا دیے جاتے ہیں جلسے ممنوع قرار دیے جاتے ہیں، تقریر کی اجازت نہیں دی جاتی، کیا یہ بہت بڑا اور عظیم فرق نہیں ہے؟ آزادی قوم کو ہم سربلند دیکھتے ہیں، کیونکہ وہ آزادی اور اس کی قدر و قیمت سے واقف ہے، وہ جس خیال پر چاہے قائم رہے، اس کے برعکس غلام قوم ذلیل و رسوا نظر آئے گی، اس لئے وہ غلام ہے، وہ وہی کہے گی، جو بتایا جائے گا، وہ اپنی نہیں اپنے آقا کی زبان سے بولتی ہے، اس کے سینے میں دل ہے، لیکن یہ دل اس کا نہیں کسی اور کا ہے، وہ ایسی باتیں کہتی ہے جن پر خود اس کا اعتقاد نہیں، وہ ایسی چیزوں پر اعتقاد رکھتی ہے، جس کا وہ اعتراف نہیں کر سکتی، وہ اپنے نفس کو دھوکا دیتی ہے، جب وہ کچھ لکھتی ہے یا کہتی ہے، تو تعزیر و سزا کے ڈر سے تول تول کے بات مُنہ سے نکالتی ہے، اور پھونک پھونک کر قلم چلاتی ہے، کیا یہ ماحول کا فرق نہیں ہے؟ یہ ماحول ہی قوت ہے جو انسان کے تخیّل کو ختم کر دیتی ہے، قادر کو عاجز بنا دیتی ہے، خطیب کو گونگا کر دیتی ہے، انشا پرداز کا قلم چھین لیتی ہے۔ بینا کو اندھا بنا دیتی ہے، سُننے والے کو بہرا کر دیتی ہے اور اس کا تربیت

پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔

ماحول اور سوسائٹی

جس ماحول اور سوسائٹی میں انسان پلتا اور بڑھتا ہے، اس کا دل سیرت اور کردار پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے، اس کے اخلاق، عادات، خیال، میلان، ہر چیز پر وہ چھا جاتا ہے، اگر وہ اچھا ہے، تو اس کا اثر بھی اچھا ہی پڑے گا، اور اگر بُرا ہے تو اس کا اثر بھی بُرا ہی ہوگا، وہاں ذہانت نابود ہو جائے گی، فراست ناپید ہو جائے گی، اپنی چیزوں سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت بھی باقی نہ رہ جائے گی۔ ایک مرتبہ مشہور مصری مورّخ اسماعیل رافت بک نے کہا تھا، "مصر میں خزانے بھرے پڑے ہیں، لیکن انھیں صرف غیر ہی ہاتھ لگا سکتے اور ان سے اپنی جھولی بھر سکتے ہیں" غرض ماحول کا بُرا اثر پڑتا ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تربیت اور تجربہ

تربیت اور تجربہ سے بچہ بہت متاثر ہوتا ہے، وہ آگ دیکھ کر ڈر جاتا ہے، انگارہ کے پاس نہیں پھٹکتا، اس کی جو عادت بن جاتی ہے، وہ اس میں راسخ ہو جاتی ہے، پھر نہیں چھوٹتی، خواہ وہ اچھی ہو یا بُری اور اجتماعی فرائض کو ادا کرنے کے جذبہ سے بھرپور ہوتے ہیں، مثلاً ہاکی کی ٹیم میں کھیلنے والا ایک لڑکا، کتنی کچھ کوشش نہیں کرتا، لیکن کیا اس کی یہ کوشش اس کی ذات کے لیے ہوتی ہے؟

نہیں جماعت کے لیے ٹیم کے لیے ! وہ اس جماعت کا اپنے تئیں
ایک رکن سمجھتا ہے ، اگر جماعت کی تعریف ہوئی ، گویا اس کی
ہوئی ، اور اگر جماعت ناکام رہی تو گویا وہ ہار گیا ، خواہ کتنا
ہی اچھا کھیلا ہو ، جماعت کی کامیابی پر وہ خوش ہوتا ہے ،
ناکامی پر کڑھتا ہے ، یہی وجہ ہے کہ وہ اس کی کامیابی کے
لیے پورا زور لگاتا ہے اور شکست کے خوف سے بڑھ بڑھ کر
آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے ، پورے اخلاق و صداقت
کے ساتھ وہ جماعت کی کامیابی کے لیے از سرِ نو کوشش کرتا
ہے ، یہی وجہ ہے کہ اجتماعیت سے بچّہ کی سیرت اور کردار
پر بڑا اثر پڑتا ہے ، اور یہ آگے چل کر بہت مفید ہوتی ہے ،
اور زندگی کے سنوارنے میں بہت مدد دیتی ہے ؎

---

(۸)

تربیت کی غرض و غایت

صورتِ مسئلہ پر ایک محققانہ نظر

تربیت بہت سے مفکرین و ماہرین نے مختلف تعریفات اور تعبیرات کی ہیں، اور یہ تعریفیں شخصی اور ذاتی رجحانات کا آئینہ ہیں، ایک بڑے فلسفی کا قول ہے کہ "تربیت کا مقصد عقل کی جلا ہے"؛ ایک دوسرے فلسفی کا خیال ہے؛ "تربیت سے مراد شخصی زندگی کا نکھار ہے!" بعض دوسرے ماہرین فن کا خیال ہے کہ تربیت صحیح وہ ہے، جس سے اخلاق درست ہو، دینی اور مذہبی شعور پیدا ہو، عقیدہ مستحکم ہو، بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے، کہ تربیت کا اصل مقصد درجۂ کمال تک پہنچنا ہے، یہاں تک کہ وہ سوسائٹی کے لیے بہترین اور کارآمد بن جائے۔

اغراض و مقاصد

یہ اور اس طرح کی دوسری تعریفیں تربیت کے اغراض و مقاصد کو صحیح طور پر واضح نہیں کرتیں، اگر نگاہِ غور و تحقیق سے ان تعریفوں کو پرکھا جائے، تو ماننا پڑے گا کہ یہ تعریفیں اپنے اپنے محل اور موقع پر صحیح ہیں، عمومی اور مجموعی حیثیت سے نہیں، تربیّت کے اغراض و مقاصد، زمانہ، ماحول، اور قوموں و ملتوں کی ضروریات و حالات کے ماتحت بدلتے رہتے ہیں، بدلتے رہیں گے، ہر قوم کے ہاں اس کی ضروریات و حالات کے ماتحت بدل جاتے ہیں، مثال میں ہم اثینیا اور اسپارٹو کو پیش کر سکتے ہیں، یہ دونوں یونانی ہیں، اثینیا کو حکمت و فلسفہ سے ذوق تھا، ادب اور لٹریچر سے شغف تھا، اس کے برعکس اسپارٹو کو دنگل اور کشتی کا شوق تھا، ورزش اور جسمانی تربیت سے لگاؤ تھا، ظاہر ہے ان مختلف قسم کے رجحانوں سے تربیّت کے اغراض و مقاصد بھی بدل گئے، اور وہ ہو گئے جو حالات و ضروریات سے مطابقت رکھتے تھے:

تربیّت دینے والے کے لئے، یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ایک ہی نقطۂ نظر سے چمٹ جائے، اور دوسرے نظریات و خیالات کو بالکل مہمل قرار دے کر نظر انداز کر دے، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانیت کی فلاح اور برتری سے متعلق

تمام پہلوؤں پر یکساں سنجیدگی سے غور کرے، تاکہ انسان کی فکر رسا ہو جائے، اس کے قوئی مضبوط ہو جائیں، اور اُسے زندگی بسر کرنے کا صحیح گُر معلوم ہو جائے، وہ ارادہ کا مضبوط ہو، اخلاق کا نمونہ ہو، جسم کا توانا ہو، علم کا شائق ہو، اس کا وجدان تربیت یافتہ ہو، اس کا ذوقِ پختہ ہو، وہ وطن دوست ہو، وہ زندگی دوسرے کے سہارے بسر کرنے کا خوگر نہ ہو، بلکہ اپنے آپ پر بھروسہ کر کے زندگی بسر کرنے کی اہلیت اور ہمت رکھتا ہو، وہ دوسروں کے لیے بھی اسی طرح زندہ رہنا چاہتا ہو، جس طرح خود اپنے لیے، اس مفہوم کو اگر دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ تربیت دینے والے کو سب سے مقدم تربیت کرنی چاہیئے، دماغ کی، دل کی، اور ہاتھ کی، انگریزی میں اس کو ۔ تھری انچ کہتے ہیں ؛

---

(۹)

تربیت کے
مختلف اقسام و انواع

تربیت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جسم کی تربیت، عقل کی تربیت اجتماعی اور اجمالی تربیت۔ ان میں سے ہر ایک بجائے خود اہم ہے، ان میں سے ہر ایک کے حصول کی کوشش ہونی چاہیئے۔

تربیت اور حیات کاملہ کی تیاری

مشہور انگریزی فلسفی ہربرٹ اسپنسر کا قول ہے، کہ تعلیم و تربیت کا مقصد یہ ہے کہ انسان، انسانِ کامل کی زندگی بسر کر سکے، اس طرح کہ اس کا جسم قوی ہو؛ اس کا اخلاق کامل ہو، اس کی فکر مرتب ہو، یہ جانتا ہو کہ دوسروں سے تعاون کس طرح کیا جائے؛ جمال اور حسن کی پرکھ رکھتا ہو، اُن کیفیات سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور ادائیگی فرض کا احساس رکھتا ہو،

قوم اور وطن کے ساتھ اُسے کیسا ہونا چاہیئے؟ یہ جاننا اور سمجھنا ہو، اللہ نے ذہن و دماغ کی جو صلاحیتیں اسے عطا کی ہیں ان سے کیونکر فائدہ اٹھائے؛ اپنے اعضا و جوارح سے کس طرح کام لے؛ مختصر الفاظ میں یہ کہ حیاتِ کاملہ کس طرح بسر کرے؛ گویا حیاتِ کاملہ بسر کرنے کی استعداد پیدا کرنا ہی تربیّت کا مقصدِ اعلیٰ ہے:

ہربرٹ اسپنسر نے انسانیتِ کاملہ، کے معیار و اقتدار سے متعلق کچھ اصول بھی وضع کئے ہیں، جو حسب حیثیت و حسب درجہ ہیں:۔

(١) وہ امور جو حفظِ نفس کی خدمت بجالائیں۔

(٢) وہ امور جو حفظِ نفس کے لیے عرضاً کارآمد ہوں یعنی بالواسطہ۔

(٣) وہ امور جو تہذیب و نشو و نما کو کامل بناتے ہوں۔

(٤) وہ امور جو تعلقات و روابط کے استحکام و قیام میں معین و مددگار ہوں، اور جو سیاسی و اجتماعی صلاحیات پیدا کرتے ہوں۔

(٥) وہ امور جو انسان کے ذوق و عواطف اور حواس کو نشو و نما کرتے ہوں۔

تربیّت کا مقصد

اگر ہم ہربرٹ اسپنسر کی رائے مان لیں، اور تربیّت کا مقصد قرار دے لیں، انسانیتِ کاملہ کی تیاری و استعداد، تو مدرّس اور معلّم پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلے خود اپنے آپ کا جائزہ لے، اور دیکھے کہ وہ ان شروط کو کہاں تک حق بجانب سمجھتا اور انھیں بجالا سکتا ہے؛ ضروری ہے کہ تدریس کے وقت وہ ان تمام باتوں کو

پوری سنجیدگی کے ساتھ پیشِ نظر رکھے اور ان کی کوشش فکر و نظر سے اوجھل نہ ہونے دے، تعلیم و تدریس کے وقت ان سے پورا پورا کام لے، حیاتِ کاملہ کی اُصل کیا ہے ؛ اس مقصد کے حصول کے سلسلہ میں ہمیں کیا کیا کرنا چاہئے ؛ کس نہج سے ؛ کس طرح ؛ کیونکر ؛ اب ہم اس سلسلہ میں مختلف پہلوؤں پیشِ نظر الگ الگ عنوانات پر، ذرا تفصیل سے گفتگو کریں گے ؛

---

(۱۰)

تربیت جسمانی

ایک فلسفی کا قول ہے زندگی میں کامیابی کی پہلی شرط یہ ہے کہ جوان قوی الجسم ہو ، یونانی زبان کا مقولہ ہے ۔ "عقل سلیم، جسم سلیم میں ہی نشیمن بناتی ہے !" مشہور انگریزی مدبر اور فلسفی جان لوک کا خیال ہے کہ یونانی مقولہ کی یہ تعریف مختصر ہے، مکمل تعریف یہ ہے کہ زندگی مکمل اور کامل بنانے کے لیے، جسم و عقل دونوں کی سلامتی ضروری ہے ، دونوں میں سے اگر ایک بھی نہ ہو تو پورا انسان نہیں ۔ وہ کسی طرح بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا ، لیکن ہمارے معلم اور مدرسے چلانے والے اصحاب کہاں تک ان حقائق کا خیال کرتے ہیں ؛ آپ کو ایسے ہی مدرسے ملیں گے، جو ایک تنگ و تاریک کوٹھری

تک محدود ہیں، جس میں نہ روشن دان ہیں نہ روشنی، نہ دھوپ، نہ ہوا، ظاہر ہے ایسے ماحول میں نہ تعلیم ہو سکتی ہے نہ تربیت، چنانچہ تربیت ذہنی مقصود ہے، اور تربیت جسمانی کا وجود اور عدم برابر ہے ؛

تربیت اور یورپ

یورپ اور امریکہ نے بیسویں صدی عیسوی کے شروع ہی میں تربیت جسمانی کی نوعیت اور ضرورت محسوس کر لی تھی، چنانچہ محکمۂ ہائے تعلیمات نے سب سے پہلے اس کوتاہی کے دُور کرنے پر زور دیا، اُنھوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ اگر جسمانی تربیت نامکمل رہی، تو کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا ؛

مدرّس اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، اگر وہ اپنے شاگردوں میں جسمی نشو ونما کے آثار نہ دیکھے، اسی بچّہ کی تربیت صحیح اور درست ہو سکتی ہے، جو بدنی اعتبار سے توانا اور مضبوط ہو، اگر صحت ناقص ہے، تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا، صحت کے درست کرنے کے لئے صاف ہوا، سورج کی روشنی مفید اور ہلکی غذا، اچھا اخلاق، اچھی عادت، معتدل ورزش مختصر اور ذہن میں اُتر جانے والے اسباق ہی اچھی تربیت کے ضامن ہیں، اسی طرح جسم بھی سنبھل سکتا ہے، اور عقل بھی،

مدرسہ صرف پڑھائی کا گھر نہیں ہے، بلکہ وہ شفاخانہ ہے،

جہاں تلمیذ کی اخلاقی اور عقلی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے، جہاں اس کی عقل اور ذہن کی کمزوریاں دُور کی جاتی ہیں، جہاں اس کے جسم اور بدن کی صلاحیتیں اُبھاری جاتی ہیں، جہاں اسے ہر جہت سے صالح، مکمل اور نیک بنایا جاتا ہے، مدرسہ بہترین ذریعہ ہے تربیت صحیحہ کا، تاکہ مستقبل میں طالب علم کا جسم توانا ہو، نشوو نما کے پورے مراحل طے کرے، کام میں ماہر ہو، افعال وحرکات میں متوازن ہو، عیوب سے خالی ہو، اور جسمانی صحت پورے طور پر حاصل ہو۔

مدرّس کے لئے ضروری ہے کہ وہ طلبا کی نشست برخاست پہ بھی نظر رکھے، لکھنے کے دوران میں مونڈھے جھکنے نہیں چاہئیں، پڑھتے وقت گردن خم نہیں ہونی چاہئے، اس سے بآسانی معلوم ہو جائے گا کون مریض ہے، کون تندرست؟ مریض کو تندرست سے الگ بٹھائیے یہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، لیکن ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

جسم اور عقل

علم النفس میں یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے، کہ جسم اور عقل کے درمیان بہت بڑا رابطہ ہے، جسم پر جو چیز اثر انداز ہوتی ہے وہ عقل پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، اسی لیے یہ بات مان لی گئی ہے، کہ عقلی تربیت بغیر جسمانی تربیت کے اور جسمانی تربیت بغیر عقلی تربیت کے ناممکن ہے، چنانچہ اسپارٹا کے لوگ عہد قدیم میں بدن اور جسم کی تربیت پر خاص زور دیتے تھے،

یونان کے ایک مشہور حکیم کا قول ہے، "زندگی کی مثال ایک دشمن کی ہے، اس پر صرف اسی طرح غلبہ پایا جا سکتا ہے کہ انسان کا بدن مضبوط اور توانا ہو!" بڑے سے بڑا ذہین آدمی بھی اپنی ذہانت سے پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، اگر وہ بیمار یا کمزور ہے ذہانت بھی صرف اسی وقت کام دیتی ہے جب انسان توانا اور تندرست ہو۔

ان حقائق کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ علم کے حصول کے ساتھ اور عقل کی درستگی کے ساتھ ہم جسم آلائش سے پاک رکھیں؛ اور جتنا ممکن ہو، اسے مضبوط بنالیں، ورزش کریں، آرام لیں، کام کریں اور چھٹی منائیں۔

امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں لکھا ہے:-

"بچہ جب مکتب سے آئے، تو ضروری ہے، کہ اُسے کھیلنے کودنے کا موقعہ دیا جائے، اس طرح تعلیم کی تھکاوٹ سے وہ آرام پا جائے گا، بچہ کھیل سے نہیں تھکتا، اور اگر اُسے منع کیا جائے تو اس کا دِل مرجاتا ہے، ذکاوت ماند ہو جاتی ہے، زندگی اجیرن ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ خلاصی اور فرار کی صورتیں سوچنے لگتا ہے۔"

جس طرح طلبہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ گھر پر اور مدرسہ میں انھیں، فرصت اور فرحت کا موقع دیا جائے، اس طرح یہ بھی ضروری ہے کہ انھیں وہ کھیل کھیلنے کی ترغیب دی جائے جن

سے ایک طرف تو ان کے اعضاء مضبوط ہوں، دوسری جانب وہ کھیل ان میں ضبط و نظم پیدا کریں، مثلاً فٹ بال، ہاکی، ٹینس دوڑ، تیراکی، کشتی وغیرہ، تاکہ طلبہ کے بدن میں چستی پیدا ہو، اور ان کی صحیح نشو و نما حاصل کر سکیں۔

اگر ان ورزشوں اور کھیلوں کی طرف طلبہ کو پورے طور پر متوجہ کیا جائے تو اس سے انھیں بڑے فوائد حاصل ہوں گے۔ ان کے پٹھے مضبوط ہوں گے، ان کا بدن توانا ہوگا۔ وہ نشو و نما کے حد کمال کو پہنچ جائیں گے۔ ان کے اعصاب مستحکم ہو جائیں گے، ان کے قوٰی میں اعتدال پیدا ہو جائے گا۔ ان کا سینہ چوڑا ہو جائے گا، ان میں نشاطِ کار کا جذبہ پیدا ہو جائے گا، اور اس طرح ان کی عقل، روح اور جسم تینوں کو یکساں توانائی حاصل ہو گی۔

تربیت عقل

تربیت عقل کا مقصد کیا ہے؟ — معرفت کا حصول، عقل کی تکمیل، اور ہر کام کے آغاز و انجام میں اعتدال و توازن، اور یہ اغراض سہ گانہ ایک دوسرے سے بالکل مربوط ہیں، انھیں جدا نہیں کیا جا سکتا، حصول معرفت کا یہ مقصد نہیں ہے، کہ امتحان سے پہلے ہر چیز رٹ لی جائے، اور امتحان کے بعد فراموش کر دی جائے، علم کی غرض ہے، اسے پورے طور پر سمجھنا، اس کی حقیقت اور ماہیت کو جاننا اور اس پر عمل کرنا، یہ خیال غلط ہے کہ علم صرف کتابوں ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، اور یادداشت بھی، علم حاصل کرنے کا واحد وسیلہ ہے، بہت سے "علوم" ایسے ہیں جو صرف تجربہ اور اطلاع سے حاصل ہوتے ہیں، ان

یادداشت اور کتابوں کی ضرورت نہیں پڑتی، علم کو محفوظ کرنے کا طریقہ زبانی یاد کرلینا نہیں ہے، بلکہ اس کی تہ تک پہنچنا اور سمجھنا ہے، اسی طرح حقائق ہیں انھیں سینہ کی کوٹھڑی میں بند کرلینا مفید نہیں ہے بلکہ ان سے فائدہ اٹھانا مطلوب ہے ؛

فہم اور حافظہ

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنے مدارس میں سب سے زیادہ جس چیز پہ لوگوں کو متوجہ پاتے ہیں وہ رٹنا اور زبانی یاد کرلینا ہے، امتحانات اسی طرح پاس کیے جاتے ہیں، ممتحن بھی اسی مغالطے میں مبتلا ہیں، وہ تلمیذ سے ایسے سوالات کرتے ہیں جن کا مدار فہم پہ نہیں ہوتا حافظے پر ہوتا ہے، لہذا طلبہ بھی فہم پہ زور نہیں دیتے، حافظ کو اصل سمجھتے ہیں۔

بہت سے کودن ایسے نظر آئیں گے، جنھیں بہت سی چیزیں زبانی یاد ہیں، لیکن سمجھتے خاک نہیں، بہت سے ایسے ذہین و ذکی طلبہ نظر آئیں گے، جن کا حافظہ تو کمزور، لیکن حقیقت کی تہ تک پہنچنے میں وہ سب سے تیز ہیں، یہ کتنی بڑی اور افسوسناک غلطی ہے کہ حافظے کو اتنی زیادہ اہمیت دی جائے اور عقل وادراک کی صلاحیت کو یکسر نظر انداز کردیا جائے، حالانکہ اصل چیز تو ادراک اور تربیت عقل ہے، نہ کہ رٹنے اور زبانی یاد کرلینے کی قابلیت ؛

کیا علم قوت ہے؟

ہر علم بجائے خود قوت نہیں ہے،
علم صرف ان حقائق کا نام نہیں ہے
جو انسان نے ایک خاص ترتیب سے وضع کر لیے، اور وضع کر لیتے
ہیں۔ اسی طرح حقائق ہیں کہ ذہن کا فہم و ادراک بغیر علم کے
ممکن نہیں ہے، صرف حقائق چنداں مفید نہیں ہوتے، ان کے
ساتھ علم کی آمیزش ضروری ہے، البتہ جس علم کو حقائق کا حامل
بنادیں، وہ بجائے خود ایک قوت ہے، لیکن ضروری ہے کہ یہ
حقائق، ایک خاص منطقی ترتیب رکھتے ہوں، ایسا علم جو حقائق
سے لبریز ہو، جس سے ہم خدمت لے سکیں جس سے ہم خدمت کرا سکیں
وہی اصل علم ہے، اس سے ہم اپنی زندگی بھی سنوار سکتے ہیں
اور دوسروں کی بھی، ایسا علم ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا، اگر فکر و
عقل کو بھی ساتھ نہ رکھا جائے، مدرس طلباء کو فہیم اور عقیل
نہیں بنا سکتا، لیکن فہم و ادراک کا انھیں شائق بنا سکتا ہے۔
یہی اس کا کام ہے، اس اشتیاق کا نتیجہ یہ ہوگا، کہ وہ علم تک
فہم و فکر کے ساتھ پہنچیں گے۔

معلم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تعلیم دیتے وقت اس
خیال کو ہمہ وقت پیشِ نظر رکھے کہ وہ صرف شاگرد کی قوتِ حافظہ
کو چمکانے کی جد و جہد نہ کرے بلکہ اس میں ایسی فہم اور ایسا
ادراک پیدا کر دے کہ طالب علم خود مقدمات سے نتائج نکال

لے، خود تاریکی میں روشنی کی کرن ڈھونڈلے ، خود متعدد، اور مختلف مسائل میں اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے کر صحیح کو غلط سے پرکھ سکے۔ یہی تربیتِ عقلی ہے، اور اگر اس حد تک ہم پہنچ گئے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مقصد حاصل کرلیا، اب شاگرد نراگاؤدی اور کودن نہیں رہے گا، بلکہ صحیح معنوں میں طالبِ علم بن جائے گا، جو اپنی عقل سے بھی، ذہن کے ساتھ ساتھ پورا اور فائدہ بخش کام لے سکے گا۔

قرونِ وسطیٰ کی تربیت

قرونِ وسطیٰ میں تربیت وتعلیم کے ماہرین سب سے زیادہ تربیتِ عقلی پر زور دیتے تھے، وہ اپنے مدارس میں بیک وقت دو زبانوں کی تعلیم دیتے تھے، ایک تو یونانی، دوسری لاطینی، ان دونوں زبانوں کی تعلیم، مدارس ثانوی سے شروع ہوتی تھی، اور گرامر کی تعلیم مدارس ابتدائی سے شروع ہوجاتی تھی، ان کا خیال تھا کہ اس طرح لڑکے کی عقل میں جلا اور تیزی پیدا ہوتی ہے، اور تربیتِ عقلی میں مدد ملتی ہے، اس کے قوائے عقلی تنومند ہوجاتے ہیں، اور وہ علم کو عقل کے پیمانہ سے ناپنے کی صلاحیت پیدا کرلیتا ہے، لیکن ان لوگوں نے صرف اسی اصول پر ضرورت سے زیادہ زور دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سلسلہ کی بعض دوسری ضروری چیزیں اُن سے نظر انداز ہوگئیں، ایک ماہرِ تعلیم و تربیت

کا قول ہے :۔

" حافظہ اچھی چیز ہے، تاریخ اور لغت کے سلسلہ
میں تو یہ بہت زیادہ معین و مددگار ہوتا ہے، لیکن
ذوق بھی بڑی اچھی چیز ہے، زبان و لٹریچر کا وجدان
صحیح اس سے پیدا ہوتا ہے، خیال بھی اپنی چیز ہے،
اس سے ذوق شعری کی تکمیل میں خاصی مدد ملتی ہے
لیکن ان سب کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انشار
اور القاد (تحریر و تقریر) پر بھی پورا زور دیا جائے اور
اس میں اس وقت تک درجۂ کمال نہیں حاصل کیا
جا سکتا، جب تک علوم ریاضی، حساب، ہندسہ، الجبرا
وغیرہ میں بھی درک نہ ہو "

لیکن میرا خیال ہے کہ تربیت عقلی کی تکمیل کے لیے صرف
مذکورہ چیزیں ہی کافی نہیں ہیں، ضروری ہے کہ مشق و تمرین
کا بھی پورا خیال رکھا جائے، تاکہ علم عمل سے بھی ہم آہنگ ہو
اور عمل عقل کی رہنمائی کا نتیجہ ہو:

عقل اور چھری

بعض خوش فہم لوگوں کا تربیت عقلی کے
بارے میں یہ خیال ہے کہ تربیت عقلی کی
مثال دھار دار چھری کی سی ہے، اگر چھری کی دھار خوب تیز
ہو، تو اس سے ہر وہ چیز کاٹی جاتی ہے، جس کا کٹنا چھری سے

ممکن ہے، لیکن یہ خیال غلط ہے، عقل اگر تربیت یافتہ ہو، تو
وہ ہر چیز کو نہیں کاٹ سکتی، اسی کو کاٹے گی، جسے کٹنا چاہیئے!
بعض اصحاب کا خیال ہے، اگر حساب، ہندسہ، جبرو مقابلہ
گرامر اور لغات کا علم صحیح طور پہ حاصل ہو جائے، تو فکر صحیح اور
عقل سلیم کا جوہر پیدا ہو جاتا ہے، اور آدمی صحیح نتائج مرتب
کر سکتا ہے، لیکن یہ لوگ اسے بھول جاتے ہیں کہ عقل اور چھری
میں بہت فرق ہے ہمیں اس مغالطہ سے آزاد ہو جانا چاہیئے،
چھری سے بار بار غلطی ہو سکتی ہے اور عقل سے کبھی نہیں، زندگی
کے صحیح اصول اسی کی روشنی میں مرتب اور بروئے کار لائے
جا سکتے ہیں۔

---

(۱۲)

تربیت خلقی

تربیتِ خلقی سے مراد کیا ہے؛ — تربیتِ خلقی کے معنی ہیں، حسن سلوک، ارادہ کی استقامت، اور صحت، بُرائی سے اچھائی کا انتخاب، کوڑے کرکٹ سے بھلی چیزوں پر نگاہ، برائی سے بچنا اور اچھائی اختیار کرنا۔

تربیتِ خلقی کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی کا اخلاق بلند ہو جائے، اس کا عزم مضبوط ہو جائے، اس کے قول وفعل میں ربط اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے، تربیت خلقی دراصل زندگی، تہذیب، گھر اور مدرسہ کی روح ہے۔

ماہرین تربیت کا خیال

ہم اگر یہ کہیں تو ذرا بھی مبالغہ نہیں کریں گے کہ اس زندگی میں

سب سے زیادہ ضروری اور ناگزیر چیز تربیت خلقی ہی ہے، تربیت کے ماہرین کا خیال ہے، کہ جس طرح ہم جسم اور عقل کی تربیت پر زور دیتے ہیں، اسی طرح ہمیں اخلاق کی تربیت کو بھی اہم سمجھنا چاہیے، اور اس پر بھی زور دینا چاہیے۔ اگر ہم اسے نظر انداز کر دیں گے، تو علم وعقل اور رُوح کی تربیت بھی بیکار جائے گی، بلکہ نامکمل رہے گی، ایک شاعر کا قول ہے کوئی قوم اگر اخلاق سے محروم ہو گئی تو مر گئی۔

دوسرے اجزاء

شاگرد کے لیے صرف مدرسہ ہی تربیت اخلاق کا ذریعہ نہیں ہے، صرف مدرسہ اخلاق کی مکمل تربیت نہیں کر سکتا، کچھ دوسرے اجزا بھی ہیں جو مدرسہ سے زیادہ اس کام کو کر سکتے ہیں، اور کرتے ہیں وہ دوسرے اجزاء، جو بچّہ کی اخلاقی تربیّت کو سنوارتے یا بگاڑتے ہیں، یہ ہیں: گھر اور سماج، مدرسہ دوسری تمہیدوں میں تو اپنے فرائض کماحقہ ادا کر سکتا ہے، لیکن اخلاقی تربیّت میں مدرسہ سے کہیں زیادہ، گھر اور سوسائٹی کا اثر ہوتا ہے، گھر اور سوسائٹی کے اشتراک ہی سے مدرسہ اس باب میں کچھ کر سکتا ہے، گھر میں جو اخلاقی تربیّت ہو، سوسائٹی میں پہنچ کر وہ رائیگاں نہ جائے، اور سوسائٹی میں اخلاق جس سانچے میں ڈھلیں، گھر پر پہنچنے کے بعد، وہ اکارت نہ جائیں، سوسائٹی اور گھر میں، جو اخلاق بنے، وہ مدرسہ میں پہنچنے کے بعد غارت نہ

ہو، یہ تینوں اجزا، جب تک کامل اشتراک و تعاون سے کام نہ کریں اخلاق کی تربیت مکمل نہیں ہو سکتی، مدرسہ، قلب، ہاتھ اور دماغ کی تربیت تو پورے طور پر کر سکتا ہے، لیکن اخلاق کی تربیت بڑی حد تک صرف سوسائٹی، اور گھر ہی پر منحصر ہے، گھر اور سوسائٹی کے اس اثر کو ہم نظر انداز کر دیں، تو ایک بہت بڑی حقیقت کو نظر انداز کر دیں گے، گھر اور سوسائٹی کی تاثیر کبھی مفید ہوتی ہے، کبھی مضر، کبھی نفع بخش ہوتی ہے کبھی نقصان دہ، یہ مدرس کے بس کا روگ نہیں کہ جو کام سوسائٹی اور گھر والوں سے نہ ہو سکے، اسے کر دکھائے۔ وہ صرف اس راستہ میں مددگار بن سکتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، وہ تلمیذ کی عقل تیز کر سکتا ہے، اس میں علم کا شوق پیدا کر سکتا ہے، معرفت نفس کے طریقے بتا سکتا ہے، دنیا کیا ہے اور دنیا نے کیا کیا ہے؟ یہ بتا سکتا ہے۔ وہ فطرت کی نعمتوں کی طرف اشارہ کر سکتا ہے، بلکہ وہاں تک پہنچا بھی سکتا ہے، وہ بچہ کی اخلاقی تربیت کا راستہ بھی منور کر سکتا ہے، وہ اس میں سچائی پیدا کر سکتا ہے، امانت کی روح پیدا کر سکتا ہے، انصاف اور عدالت سے روشناس کر سکتا ہے، شجاعت اور اخلاص کی امنگ پیدا کر سکتا ہے۔ بھلائی کی محبت، قیادت کی عظمت، ابتکار و اختراع کا شوق پیدا کر سکتا ہے، سب کچھ کر سکتا ہے، لیکن اخلاق کی تربیت وہ اکیلا نہیں

کر سکتا، اس میں گھر اور سماج کو بھی حصّہ دار بننا چاہیئے، بننا پڑے گا۔

تربیت خلقی کا مقصد

تربیت خلقی کا صحیح مقصد یہ ہے
انسان کو مہذّب بنا دیا جائے،
اس میں سرداری کی اہلیت پیدا کردی جائے، اس کے ارادہ میں استقامت پیدا کرائی جائے، اس میں عزم صادق پیدا کر دیا جائے، اچھائی کی طرف مائل کر دیا جائے، اور برائی سے متنفر کر دیا جائے، اگر اس مقصد کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو ضرور ہے کہ بچّہ جس گھر میں رہتا ہے وہ مہذّب ہو، جس مدرسہ میں پڑھتا ہے، وہ مہذّب ہو، اور جس سوسائٹی میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ وہ مہذّب ہے۔

---

(۱۳)

تربیت اجتماعی

تربیت اجتماعی بھی ایک قوم کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی عقل، اور جسم کی تربیت، اجتماعی تربیت کے مراکز صرف تین ہیں۔

(۱) گھر۔

(۲) مدرسہ

(۳) سوسائٹی

بچپن ہی سے یہ جذبہ معلم کو متعلم کے دل میں پیدا کرنا چاہئے کہ جو کچھ اپنے لیے پسند کرے، وہ اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کرے، گھر میں، مدرسہ میں، سوسائٹی میں، دوستوں رفیقوں اور عزیزوں کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کرے، جو کچھ سوچے

صرف اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے بھی، اور دوسروں کے لئے اسی طرح سوچے، جس طرح اپنے لیے سوچتا ہے، اگر بچپن ہی سے کھاتے ہیں، کھیلتے ہیں، تفریح میں، دوسروں کے ساتھ اشتراک کی عادت پڑ جائے گی، نوجوانی کی عمر تک پہنچتے پہنچتے یہ طبیعت ثانیہ کی صورت اختیار کرے گی، پھر وہ زندگی کی تمنا صرف اپنے ہی لیے نہیں کرے گا، دوسروں کے لیے بھی زندہ رہنے کا حق چاہے گا۔

خود غرضی

چونکہ عام طور پر، تربیت اجتماعی کو اہمیت نہیں دی جاتی، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی میں خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے، وہ صرف اپنے لیے جینا چاہتا ہے، دوسروں کے بارے میں کچھ نہیں سوچتا، لڑکا اگر گھر میں ہے تو چاہے گا، ماں باپ کی شفقتیں صرف اسی کے لیے وقف رہیں، دوسرا اس کا ساجھی نہ بنے، اگر مدرسہ میں ہے تو اس کی خواہش ہو گی، استاد کی عنایتیں اور مہربانی اس پر برسیں، وہی سب سے آگے رہے، اس کی سب سے زیادہ پوچھ ہو، اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ تکلیف، مستحق ساتھیوں کو پیچھے ہٹانا چاہتا ہے، ٹرام یا بس کے انتظار میں پہلے سے جو لوگ کھڑے ہیں، ان کی پرواہ کیے بغیر خود سب سے پہلے چڑھ جانا چاہتا ہے، ریل سے لوگ اُترنے نہیں پاتے، کہ آدمی چڑھ جانے کے لیے لپکتا ہے، ٹکٹ دینے کی کھڑکی پر

مجمع ہوتا ہے لیکن اس مجمع کو اس کے حق سے محروم کر کے چاہتا
ہے سب سے پہلے ٹکٹ اُسے مل جائے، یہ اور اس طرح کی
دوسری باتیں بھی ظاہر کرتی ہیں، کہ تربیت اجتماعی ناقص ہے،
اور یہ نقص نہ ہوتا اگر گھر، مدرسہ اور سوسائٹی میں اس کا
خیال رکھا جاتا ؛

قاعدہ مقرر ہے کہ سواری بائیں ہاتھ پر چلنی چاہیئے، داہنا
ہاتھ چھوڑ دینا چاہیئے، لیکن بہت سے موٹر نشین اور ٹیکسی دان
اس اصول کو نظر انداز کر دیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کچھ مرتے
ہیں، کچھ زخمی ہوتے ہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے : صرف اجتماعی تربیت
کے نقص کے سبب !

تہذیب و معقولیت

سکول اور مدرسوں کی اقامت گاہوں
کے ڈائیننگ ہال کا ایک نظارہ کیجئے
بھانت بھانت کے لڑکے جمع ہیں، دسترخوان بچھا ہوا ہے، کھانا چُنا
ہوا ہے، لیکن کھانے کے دستور و آئین کو نظر انداز کیا جارہا ہے،
یہ لڑکے کھانا کھا رہے ہیں، لیکن کس طرح، کوئی ہاتھ سے کھا
رہا ہے، حالانکہ چھُری، کانٹا، چمچہ، ہر چیز سامنے موجود ہے،
دوسرے صاحب زادے کی اُنگلیاں سالن سے تر بتر ہیں،
لیکن تولیہ یا رومال کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، حالانکہ وہ
سامنے ہے، گلاس سب کے سامنے پانی سے بھرا رکھا ہے، لیکن

ایک ہی گلاس سے یکے بعد دیگرے ، پانی پینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے ، دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے ، اس کے کونے سے پاؤں پونچھنے میں بھی کوئی تامّل نہیں ، یہ سب حرکتیں اگر اجتماعی تربیت کا فتور نہیں ہیں تو کیا ہیں ؛

لیکن اگر مدرسہ ، گھر ، اور سوسائٹی ان بظاہر چھوٹی لیکن بڑی اہم باتوں کا لحاظ رکھا جائے ، تو یہ غلطیاں ہرگز سرزد نہ ہوں ، ماں باپ سب سے زیادہ جس چیز کو غیر ضروری سمجھتے ہیں وہ اجتماعی تربیت ہے ، یہی حال اُستانیوں اور اُستادوں کا ہے ، انھیں بھی اس سے عام طور پر کوئی دلچسپی نہیں ہوتی :

ادھر جو مثالیں ہم نے درج کیں ، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تربیت اجتماعی بسا ضروری ہے اور لابدی ہے ، اس تربیت کا پہلا مرکز گھر ہے ، دوسرا مدرسہ اور تیسرا سماج ، جس طرح بچّہ کا بڑا وقت گھر میں خرچ ہوتا ہے اسی طرح کافی وقت مدرسہ میں بھی صرف ہوتا ہے ، اور سوسائٹی میں بھی وقت کا معقول حصّہ بسر ہوتا ہے ، پس یہ تینوں درحقیقت اجتماعی تربیت کے بہترین مراکز ہیں جو شخص اس تربیت سے بہرہ ور ہوگا ، وہی اپنی جماعت سماج ، قوم اور وطن کے کام آسکتا ہے :

اجتماعی کاروبار

ذرا کاروباری کمپنیوں پر نظر ڈالیے جو مالک اجتماعی تربیت سے محروم ہیں ، وہاں

یہ اجتماعی کاروبار زیادہ تر غیروں ، اور بدیسیوں کے ہاتھ میں ہے، چاہے وہ بجلی کی کمپنی ہو ، یا واٹر سپلائی کارپوریشن یا ٹرام کمپنی، تمام بڑی بڑی ملکی کمپنیاں زیادہ تر غیر ملکیوں کے ہاتھ میں ملیں گی ، اگر ہمیں بچپن میں اجتماعی تربیت ملی ہوتی ، مل کر ہم میں کام کرنے کا سلیقہ ہوتا ، اشتراک عمل اور تعاون کی اہمیت ہم سمجھے ہوتے تو یہ تمام کمپنیاں صرف ہمارے لیے ہوتیں ، صرف ہماری ہوتیں ، اس طرح غیر ملکیوں کو موقع دے کر ، ہم اپنا مالی نقصان نہیں کرتے ، بلکہ سب سے بڑی چیز جو ہم کھوتے ہیں ، یہ ہے کہ اعتماد نفس سے محروم ہو جاتے ہیں ؛

(۱۴)

تربیت جمالی

بچہ پیدا ہوتے ہی اچھی اور خوبصورت چیز کی طرف لپکتا ہے، ذرا سا ہوش سنبھالتے ہی، اس میں تجسس اور معلومات کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً حسن پسند ہے، وہ اپنی جبلت کے لحاظ سے اس کا جویا رہتا ہے کہ کوئی نئی اور عجیب بات معلوم ہو، کوئی اچھی اور خوب صورت مورت نظر آئے، تربیت جمالی کا مقصد یہ ہے کہ بچہ میں شروع ہی سے اچھی اور بری چیز میں امتیاز کرنے کا مادہ پیدا ہو جائے۔

اصول اور منہاج

تربیت جمالی کا اصول اور منہاج کیا ہے؟ ایسی چیزوں سے سابقہ، جو اس جذبہ اور مادہ کو ابھاریں، مثلاً اچھا گھر جو خوب آراستہ پیراستہ

ہو، خوشنما باغ اور باغیچہ کی سیر، دل آویز تصاویریں، مجسمے،
آنکھوں میں کھپ جانے والے رنگ، رنگین نقش ونگار، پھول،
پتیاں، ترشے ہوئے پتھر، کیاریاں، گلدستہ، روشیں، یہ سب
چیزیں بچہ کی حس جمیل کو اجاگر کرتی ہیں، ان چیزوں کا لحاظ جتنا
گھر میں ضروری ہے، اتنا ہی مدرسہ میں بھی لابدی ہے، مدرسہ
کے درجہ میں، ایسی تصویریں آویزاں ہونی چاہئیں، جو ذوق سلیم
کی آئینہ دار ہوں، موسیقی، نغمے، اور شعر خوانی سے بھی، بشرطیکہ
بہتر طرز میں ہوں، جمالی مادہ پروان چڑھتا ہے، شعر اور موسیقی
کی تعبیر بھی اس طرح کرنی چاہئے کہ اس سے بھی حُسن ہویدا ہو،
لکھنا سکھاتے وقت حروف اس طرح لکھے اور لکھوائے جائیں کہ
وہ خوشنما اور دیدہ زیب ہوں، اور بچہ کی طبیعت اپنی طرف کھینچ
لیں، ان تمام چیزوں کے دکھانے اور سکھاتے میں، وقت، نظر
ترتیب اور نظام کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہئے؛

تربیت جمال میں مدرس کو تلمیذ کے ذہن و دماغ میں خوبی اور
خوبصورتی کا نقش قائم کر دینا چاہئے، تاکہ وہ خود اس طرف مائل ہو،
اچھی چیز کو دیکھے، اچھی آواز کو سُنے، اچھے کام کو پسند کرے، اُسے
مناظر جمیلہ دکھائے جائیں اور اس کی حس اُبھاری جائے؛

زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ بچوں کے مقابلہ میں بچیوں
میں جمالی حُسن پیدا کرنے کی بالکل ضرورت نہیں محسوس کی جاتی،

حالانکہ وہ بچوں کے مقابلہ میں اس کی زیادہ مستحق ہیں، آج وہ بچی ہیں، کل وہ ماں بنیں گی، یہ ان کی نئی ذمہ داری ہے، کہ وہ اپنے گھر کو خوبصورت بنائیں، اور نئی اُمّت جو پیدا کریں' اس کی جمالی تربیت بھی کریں، دوسرے گھر میں جاکر انھیں گھر کو سنوارنا ہے، اس کا انتظام کرنا ہے، اپنے بچوں کے کپڑے سینا ہیں، تکیہ کے غلاف، رومال، میز پوش اور چادریں کاڑھنی ہیں' اور اگر ماں بننے والی عورت کی تربیت جمالی ناقص ہے، تو وہ ان میں سے کوئی کام بھی اچھی طرح نہیں کر سکے گی۔

خلاصہ کلام خلاصہ کلام یہ کہ کل جس انداز میں تربیت ہوتی تھی، آج وہ انداز بدل چکا ہے، مذہب اسلام نے تربیت پر خاص زور دیا ہے وہ دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہے، اور یہ بجز بہترین تربیت کے ممکن نہیں، خدائے بزرگ و برتر اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے :"۔اللہ نے تمہارے لیے آخرت میں جو کچھ رکھا ہے اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ لیکن دنیا میں تمہارا جو حصّہ ہے اُسے فراموش نہ کرو" ! سرکار دو عالمؐ کا ارشاد ہے :۔ تم میں سے وہ آدمی اچھا نہیں ہے، جس نے دنیا کے لیے دنیا چھوڑ دی، بلکہ تم میں بہتر وہ ہے جس نے یہ بھی لیا، اور وہ بھی لیا !" ایک اور موقع پر ارشاد ہوا۔ "دنیا کا کام اس طرح کرو۔ جیسے تم ہمیشہ زندہ رہو گے، اور آخرت

کا کام اس طرح کرو، جیسے کل ہی مرجاؤ گے"!

ان ارشادات کا حاصل کیا ہے؟ ــــ یہ کہ ہم کسی ایک چیز سے نہ چمٹ جائیں، دنیا کو پکڑیں تو دنیا ہی کے نہ ہو رہیں، آخرت کی طرف متوجہ ہوں تو دنیا سے منہ نہ موڑیں، بلکہ غلو کو چھوڑ کر اعتدال کا راستہ اختیار کریں، اور دین و دنیا دونوں کو حاصل کرنے کی کوشش کریں، ہمیں چاہیئے کہ ہم ہر نوع کی تربیت حاصل کریں، ہر کام کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں، اور جو کچھ کریں اچھی طرح کریں، ہم جب تک جیئیں، تو اچھی اور شان دار زندگی کے مالک ہوں، اور ساتھ ہی ساتھ ہمارا دین بھی مکمل ہو، خدا نے جو نعمتیں ہمیں دی ہیں، ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور کسی شعبہ میں بھی ناقص اور کمزور نہ رہیں!"

---

(۱۵)

اغراضِ تربیت

جان رسکن کا قول ہے :-

"جب تم کوئی کام کرو، تو اس کا کھوج لگاؤ، اس کام کی طرف تمھیں کس جذبہ اور خیال نے متوجہ کیا؟ "کردن" کے اسباب و بواعث، افراد و اشخاص کے بدلتے رہتے ہیں، جب تم یہ کھوج لگاؤ گے، تو گویا ایک راز کی نقاب کشائی کرو گے، جب تم یہ کھوج لگاؤ گے، تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ سب کچھ انہی میں ہے، ہو سکتا ہے کہ صبح کو ایک جذبہ تمہیں ایک کام کرنے پر مائل کرے، اور شام کو فکر و خیال ایک دوسرا دروازہ عمل کا کھول دیں، لیکن جب بھی کچھ کرو

پہلے سوچ لو، اس عمل کا محرک اور باعث کیا ہے"؛

اجتماعی مفاد

اس قول پر میرا اضافہ یہ ہے کہ شخصی اور اجتماعی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ جب ہم تربیت دینا چاہیں، تو ہمیں سب سے پہلے — مدرس کو مدرسہ میں، اور تلمیذ کو درجہ میں داخل ہونے سے پیشتر — یہ سوچنا چاہیے کہ اس تربیت کا مقصد، اور منشا کیا ہے؛

اس بحث کا کہ تربیت کے اغراض کیا ہیں؛ مدارس پر ہے کہ ہم حقائق ممکنہ کی تلاش میں بہت دُور نکل جائیں، لیکن غراض حقائق سے زیادہ بڑے ہیں، تمام دور از کار باتوں سے پیشتر یہ کچھ سمجھ لینا چاہیئے کہ اصل چیز عمل ہے، وہ عمل جو خالص، اور صحیح ہو، اور یہ بغیر تربیت کاملہ کے نہیں حاصل ہو سکتا تربیت کی اصل غرض و غایت صرف یہ ہے کہ غلطیاں کم سے کم ہوں، اور نا سمجھی کی بنا پر بالکل نہ ہوں، تاکہ تلامیذ اچھی اور مکمل زندگی بسر کرنے کی استعداد پیدا کر سکیں، صرف اس طرح نہیں کہ امتحانات میں سوالات کا جواب خاطر خواہ دے دیا۔ بلکہ اس طرح کہ علم اور اس کی ماہیت، ان کے عمل سے آشکارا ہو، ان میں اپنے اوپر اعتماد کرنے کی صلاحیت اور حوصلہ ہو؛

اب ہم اس سلسلہ میں، کچھ اور باتیں، جو نفس مسئلہ سے

خاص تعلق رکھتی ہیں، لکھیں گے ۔

غرض و غایت

فروبل ، اسٹینلی ہال، جان ڈیوی ماریا مانٹسوری اور ہیلن پارکھرسٹ کا شمار تربیت و تعلیم کے خاص الخاص رہنماؤں میں ہے، اور ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ تربیت کی غرض و غایت درجۂ کمال تک پہنچنا زندگی کو خوشگوار بنانا، اور زندگی بسر کرنے کے صحیح اصولوں کو معلوم کرنا ہے، تربیت زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے احاطے میں لے لیتی ہے، وہ فکر، شعور اور عمل کسی چیز کو نہیں چھوڑتی وہ بچہ کی زندگی کے ہر لمحہ اور دن پر گہری نظر رکھتی ہے ؛

ارسطو کا قول تھا، کہ "تربیت" ایک نئے آدمی" کو ایجاد کرنی ہے، جو فکر و عمل ہر اعتبار سے بڑا ہوتا ہے :" ڈاکٹر آرنلڈ مشہور انگریز ماہر تعلیم و تربیت کا قول ہے کہ "تربیت سے فکر میں اعتدال اور عمل میں توازن پیدا ہوتا ہے ؛

ہمارے مدرسوں میں تربیت کی اصل غرض و غایت بہت کم حاصل ہوتی ہے، لہذا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ شاگرد، عمل اور ذہنی اعتبار سے ناکام رہتا ہے۔ لیکن جن ممالک نے —— مثلاً —— جاپان، امریکہ انگلستان وغیرہ —— اس کی غرض و غایت سمجھ لی ہے، وہ اپنے طلبہ کو صحیح معنی میں زیور تربیت و تعلیم سے آراستہ کر دیتے ہیں ؛

چینی مدنیت

قدیم چینی اور ایتھنی مدنیت میں کافی فرق ہے، مثلاً یونان کے ایتھنی بڑے چیست وچالاک تھے، اور چینی سُست، اور کاہل، یہی چیز ان دونوں قوموں کے لٹریچر اور کردار میں بھی ملتی ہے، کسی ایتھنی کو اگر دیس نکالا دیا جاتا تھا، تو وہ جھٹ ایک جماعت تیار کرکے اس کا لیڈر بن جاتا تھا، تاکہ اپنے دیس، اور اپنی حکومت کے پایۂ تخت پر قبضہ کرلے، اگر کسی چینی کو دیس نکالا ملتا تھا، تو قسمت پر شاکر ہوکر وہ کسی پہاڑ کی کھو یا غار میں گوشہ نشین ہوجاتا تھا، اور یادِ الٰہی میں عمر بسر کر دیتا تھا۔ ان دونوں تمدنوں کا یہ فرق کیا تربیّت کا فرق نہیں ہے؟ چینی تربیّت ویسا نتیجہ، اور اس کا پرتو قوم کے کردار اور عمل ہیں ؎

مثلاً آخری جنگ عظیم سے پہلے کے جاپان کو دیکھے اس کے ہاں تربیّت کی غرض و غایت صرف ایک تھی، ایجاد، اختراع! ایک نئی قوم کی ایجاد، ایک نئی قوم کی اختراع، چنانچہ اس نے ایک ایسی قوم ایجاد کرلی۔ جو مہذّب تھی، محبِّ وطن تھی، حکومت وفادار تھی۔ علم کی شائق، اور تبلیغ علم کی حریص تھی، جاپان نے بہت تھوڑی مدّت میں ترقی کرلی، اور یہ سب تربیّت ہی کا طفیل تھا، جاپان نے دوسروں کے بالعموم، اور انگریزوں کے بالخصوص تجارت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا، اور اس فائدے

کو اپنے مکتبوں اور مدرسوں میں عام کر دیا، انھوں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور اپنے کام میں لگ گئے، اور آخر کار وہ عمل کی منزل تک پہنچ گئے، جاپان کی ترقی اور فروغ کا صرف یہی ایک سبب ہے، تعلیم و تربیت کے بارے میں جاپانی بڑے مستعد۔ اور سخت ہیں۔ رعایت کرنا اور نرمی برتنا جانتے ہی نہیں، اُن کا عقیدہ ہے، علم مشکل ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں۔

عہد قدیم کے عیسائیوں کو دیکھیے، انھوں نے پہلے ہی قدم پر ٹھوکر کھائی، اُن کی تعلیم و تربیت کا مقصدِ وحید کلیسا و گرجا کی خدمت تھی۔ وہ شاگرد کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے تھے، صرف کلیسا کی خدمت ان کے پیشِ نظر رہتی تھی، دُور بین مورخوں کا خیال ہے کہ فرانس کی بغاوت، درحقیقت اسی کلیسا پرستی، اور غلط انداز کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھی، مواد پکتا رہا، اور آخر ایک دن پھوٹ پڑا۔

انگریزوں کا اندازِ تربیت

اب انگریزوں کے اندازِ تربیت و تعلیم کو دیکھیے، اُن کے ہاں تربیت کا مقصد و منشا یہ ہے کہ حکمران قوم پیدا کریں جو اپنے اوپر بھی حکومت کرے، اور دوسروں پر بھی ان کا حکم چلائے، لیکن یہ مقصد نہیں حاصل ہو سکتا ؛ اگر وہاں کے استاد، اپنے شاگردوں میں خوش کار، تحمّل، برداشت، ضبط نفس، کا مادّہ نہ پیدا کریں"

اگر ان میں صحت کا احساس نہ پیدا کیا جائے ، اس تربیت کا آنکھوں دیکھا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے بڑے حصہ پر ان انگریزوں نے ٹھاٹھ اور شان سے حکومت کی ۔ جو اس تربیت سے بہرہ ور تھے انگریزوں میں اگر قدامت پرستی نہ ہوتی اور روایات قدیمہ کے دھڑے پر چلنے کا مرض نہ ہوتا ، تو شاید وہ آج دنیا کی سب سے بڑی قوم کے فرد ہوتے ۔

امریکہ کے مدارس و مکاتب پر ایک نظر ڈالیے ، امریکی تربیت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے مختلف مذاہب کے پرستاروں مختلف تہذیبوں کے فرزندوں ، مختلف قومیت اور جنسیت رکھنے والوں کے متضاد اور متباین مجموعہ کو ایک قوم ، ایک جنس اور ایک وحدت بنا دیا ، امریکیوں کو ایک خاص بات بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں یہ آسانی تھی کہ انگریزوں کی طرح روایات قدیمہ کے چکر میں نہیں پھنسے ہوئے تھے ، اس لیے کہ روایات موروثی کے خزانے سے ان کا ماضی بالکل خالی تھا ، اس لیے وہ ارسٹاکریسی کے عیب سے بری رہے اور ڈیموکریسی کی نعمت سے مالا مال ہو گئے ، امریکہ میں لوگ پہنچے وہ ارسٹاکریسی کو بھول گئے ، اور ڈیموکریسی کا کلمہ پڑھنے لگے ، اب وہ مختلف ممالک ، اور قومیتوں کے باشندے امریکی ہیں ، صرف امریکی اور کچھ نہیں ، فرض کیجیے نوواردوں کو کچھ تڑپ اپنے قدیم وطن اور ماضی کی ہو بھی ، لیکن ان کے لیے تو امریکی کے سوا کچھ اور بن نہیں سکتے ، وہاں کے مدرسے ان بچوں کو خالص امریکی

رنگ میں رنگنے، ان کے اعمال و عواطف کو امریکی سانچے میں ڈھالنے کے قابل قدر فرائض انجام دے رہے ہیں، اور اس کا اثر ان کے اخلاق و عادات پر بڑا گہرا پڑ رہا ہے ؛

اغراض و مقاصد کی تبدیلی

اب ہم پھر اپنے سابقہ موضوع گفتگو پر آتے ہیں یعنی اقوام و ملل کے ساتھ ساتھ تربیت کے اغراض و مقاصد بھی بدل جاتے ہیں اور اس اصول کو پیش نظر رکھ کر اغراض تربیت کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر ہم گفتگو کرتے ہیں۔

مقصد زندگی

اکثر باپ، خاص کر صناع، تربیت و تعلیم کا مقصد صرف یہ سمجھتے ہیں : کہ آگے چل کر بچہ، روٹی کما سکے، یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی سکھانے لگتے ہیں، بعض کا تو یہ خیال ہوتا ہے، کہ پڑھنے لکھنے میں وقت ضائع کرانے سے کیا فائدہ ؛ کیوں نہ بچہ کو ابھی سے لوہاری یا زرگری کے کام پر ڈال دیا جائے۔

اس قسم کے خیالات اکثر ان اقوام کے افراد کے دلوں کو اپنا نشیمن بناتے ہیں، جو نادار اور غریب ہوتی ہیں وہ علم کو علم کی حیثیت سے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کا بچہ حرف شناس ہو جائے، خط لکھ پڑھ لے، تھوڑا سا حساب سیکھ لے، اور صناعی کاموں میں لگ جائے ؛ کہ اپنی زندگی

ہی ہیں وہ بیٹھے کی کمائی کھا سکیں ۔

ہم حرفتی اور صنعتی کاموں کے سیکھنے کے مخالف نہیں ہیں ، لیکن ہم اسے پسند نہیں کرتے کہ تعلیمات کو نظر انداز کر دیا جائے ، اس طرح جو فن حاصل ہوگا ، وہ زیادہ اچھا کام نہیں دے سکے گا ، اگر کوئی آدمی بالکل مجبور ہے تو اُسے اختیار ہے کہ اپنے لڑکے کو بغیر کچھ پڑھائے ہوئے اپنے کام میں لگالے ، لیکن تعلیم کے بغیر وہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے جو حاصل ہونے چاہئیں ۔

بلاشبہ روزی کمانے کا مسئلہ ہر شخص کی زندگی کا اہم ترین اور پیچیدہ ترین مسئلہ ہے ۔ لیکن آدمی صرف کمانے ہی کے لیے تو زندہ نہیں رہتا ، بلکہ کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں ، جو روزگار سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں ، ہمیں بھی سوچنا چاہیے ، مثلاً ایک کاریگر نے وقت مقررہ تک کام کیا ، اور فرصت مل گئی ، اب باقی وقت کیا کرے گا ؟ وہ کچھ پڑھ نہیں سکتا ، کچھ لکھ نہیں سکتا ، اب یہ سارا خالی وقت کس مصرف میں صرف ہوگا ؟ وہ یہ وقت آوارہ گردی میں صرف کرے گا ، حکومت کا فرض تو یہ ہے کہ وہ جاہل مزدوروں کو بھی خواندہ بنائے تاکہ ان کا فاضل وقت ضائع نہ جائے ، اور وہ کام کے آدمی بن سکیں ، اور ملک وقوم کے مفید جزء ثابت ہوں ،

تحصیل علم

بعض معلّمین کا خیال ہے کہ تربیت ، تعلیم کے مرادف ہے ، حالانکہ یہ بالکل غلط اور مہمل خیال

ہے، علم اپنی جگہ پر ہے اور عمل اپنی جگہ پر ، اور تربیّت اپنی جگہ پر ایک آدمی گرامر کے تمام قواعد ازبر کرے ، معانی ، بیان، بدیع، فصاحت ، بلاغت کا ایک ایک اصول گرہ میں باندھ لے ، لیکن نہ وہ کوئی اچھی کتاب لکھ سکتا ہے ، نہ عمدہ مقالہ ، نہ کسی کتاب پر فنّی اعتبار سے نقد وتبصرہ کر سکتا ہے ، نہ کسی نئے موضوع کو تلاش کر سکتا ہے ، کیوں ؟ اس لیے کہ اس کا علم ، عمل سے ہم آہنگ نہیں ہے ، یہ چیزیں لازم و ملزوم ہیں ۔ اگر الگ الگ رہیں گی ، تو ناکامی ہوگی ، مل جائیں گی تو کامیابی ،

ہماری قوم میں ذہانت کی کمی نہیں ہے ، ہے ، لیکن قبر میں دفن ہے ، اس لیے کہ طلبہ کی تربیّت صحیح اصولوں پر نہیں ہوتی، ان میں سوجھ بوجھ ہے ، لیکن خام ، ہم نے رٹنے کو حاصل کامرانی سمجھ لیا ہے ، حالانکہ رٹائی سے کچھ نہیں ہوتا ، اصل چیز ہے علم کے ساتھ ، تربیّت ، عقل و دماغ ، ذکاوت و ذہانت ، جسم، بدن روح وفکر، ہر ہر جزو کی تربیّت صرف اس طرح ہمارا علم کامیاب اور بامقصد ہو سکتا ہے ، بغیر اس کے ہرگز نہیں ۔

حیات کاملہ

اس سے قبل کسی موقع پر ہم مختصر الفاظ میں تربیت اور حیات کاملہ کے موضوع پر الگ الگ اظہار خیال کر چکے ہیں ، لیکن وہ ناکافی ہے اس سلسلہ میں کچھ اور باتیں بھی کرنی ہیں ،

ہربرٹ اسپنسر کا خیال ہے کہ تربیت کا مقصدو منشا یہ ہے کہ انسان کو مکمل زندگی بسر کرنے کا عادی بنایا جائے اور وہ اس وقت تک حیات کامل کا حامل نہیں ہو سکتا، جب تک وہ طبعی اور تہذیبی طور پر کامل نہ ہو، طبعی اور تہذیبی طور پر کمال حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے، کہ جسم، عقل، اخلاق، قلب، ذوق ہاتھ، زبان، ہر چیز تربیت یافتہ ہو یہ نہیں ہو سکتا ہم ان میں سے کسی ایک یا چند کو تو لے لیں، اور باقی کو نظر انداز کر دیں ؛

حیات کاملہ کیا ہے ؟ کس طرح ہم اس منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں ؟ جواب بالکل آسان اور سہل ہے، تربیت کا مقصد پٹھوں کی قوت نہیں ہے، نہ ذہن، دماغ کی ورزش ہے بلکہ یہ ہے کہ اخلاق کو مستحکم بنا لیا جائے، یہ غرض تمام اغراض پر حاوی اور بھاری ہے ؛

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اخلاق کی آراستگی کے ساتھ، جسم، عقل، اور وجدان وغیرہ کو فراموش کر دیا جائے، لیکن اگر اس کا اخلاق مکمل ہے تو وہ خود ہر چیز کی تکمیل آسانی کے ساتھ کرے گا،

اخلاق کی تربیت اور کامل زندگی بسر کرنے کی رہنمائی کا کام صرف مدرسہ ہی بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے بشرطیکہ مدرس صاحبان فرض شناس ہوں، وہ اپنی اور طلبہ کی

اہمیت سے پورے طور پر خبردار ہوں، وہ شاگرد کی نفسیات سے
واقف ہوں، یہ کام ڈانٹ ڈپٹ اور مار دھاڑ سے نہیں بن سکتا
اس لئے ضروری ہے کہ استاد صحیح معنی میں تربیت خلقی پر قادر
ہو، وعظ سے بھی اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی، ہو سکتی
ہوتی تو یہ فساد اخلاق، جو ہر طرف نظر آرہا ہے، نہ ہوتا۔

اگر بچّہ کو حیات کاملہ کے لیے تیار کرنا ہے، تو اُستاد کا فرض
ہے کہ وہ اس کی کسی نوع کی تربیّت سے غفلت نہ کرے، جسم
کو اس کا حصّہ ملے، عقل کو اس کا اخلاق اور تہذیب کو اس کا جسم
اور سر کو اس کا قلب، ذوق اور زبان کو اس کا، یہ ہرگز نہیں
ہونا چاہیئے کہ ان میں سے ایک یا چند کو تو قرار واقعی، اہمیّت
دی جائے اور باقی کو مہمل اور بیکار سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے*

---

(۱۶)

عملی زندگی

اور

تربیت کی ضرورت و اہمیت

ماہرین تربیت جس چیز پر سب سے زیادہ سر کھپاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ قوم کے ہر فرد کو وہ مقام اور جگہ ملے، جس کا وہ اپنی اہلیت اور استعداد کی بنا پر مستحق ہے، اُسے ایسا کام دیا جائے جو اس کی رغبت اور میلان سے مطابقت رکھتا ہو تاکہ وہ اپنے "عمل" میں کامیاب ہو سکے، جو کام کرے اس میں لذت پائے اور اس پر فخر کر سکے، لیکن کیا یہ بات آسان ہے کہ ہر شخص کو اس کے امیال وعواطف کے مطابق جادۂ صحیح پر گامزن کر دیا جائے اور ہم اس کے لئے وہ عملی زندگی تیار کر دیں جو اس کی منتظر تھی؟ نہیں یہ مشکل کام ہے" ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ہر شخص کو اس کے میلان کے مطابق دھندے سے لگا دیتا

ہے، وہ بھی اس طرح کہ اس سے قوم کے مفادِ عمومی پر بھی ضرب نہ پڑتی ہو۔

بعض ماہرین تربیت و تعلیم کا خیال ہے کہ "ہر آدمی ہر کام کے لئے موزوں ہے"۔ لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ ہر آدمی ہر کام کر سکتا ہے یا نہیں؟ یہ ہے کہ وہ معرفت کیونکر حاصل کی جائے، جو ہر فرد کے ذوق کے مطابق ہو، لیکن ان نظریات سے بحث کرنے والے لوگ یہ نہیں جانتے کہ ہر طالب علم کے لئے کام کا انتخاب کیوں کر کیا جائے؟ بہت سی صلاحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، تربیت دینے والا نہیں جانتا ان کا مرکز کیا ہے اور انہیں کیونکر ابھارا جا سکتا ہے؟ آپ مدرسہ میں ایسے طلبہ کو دیکھیں گے، جو اپنے سبق اچھی طرح یاد کر لیتے ہیں ایسے کام چستی سے کرتے ہیں، اپنے آپ پر بھروسہ بھی کرتے ہیں۔ اُستاد کی ہدایت اور اشارۂ چشم و ابرو کے منتظر رہتے ہیں۔ لیکن ایسے طلبا میں سے کسی سے اگر پوچھئے زندگی کس طرح گزاروگے؟ کیا کروگے؟ تو وہ بڑی معصومیت اور سادگی سے جواب دے گا، اس بارے میں تو ہم نے ابھی کچھ نہیں سوچا نہ وہ یہ بتا سکے گا کہ اس کی رغبت اور رجحان کس طرف ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے؟ وہ ہرگز یہ نہیں جانتا کہ اسے علمی کاموں سے دلچسپی ہے یا ادبی کاموں سے؟ یا ریاضی اور حساب سے؟

راہ عمل

اس کے برعکس کچھ ایسے طلبہ ملیں کے جو اپنی راہ عمل منتخب کرنے کی استعداد رکھتے ہیں، وہ بتا سکتے ہیں کہ ان کا ارادہ کیا ہے؟ تمنّا اور رغبت کیا ہے؟ لیکن وہ صفات جوہری سے محروم ہیں، اس لئے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتے، ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں اور اپنا قیمتی وقت ضائع کر دیتے ہیں، ایسا وقت جو جوانی کا حاصل ہوتا ہے جس میں آدمی سب کچھ کر سکتا ہے اس کو ضروری صلاحیتوں سے محرومی کے باعث وہ گنوا بیٹھے ہیں کبھی وہ انجنیرنگ کالج میں داخلہ لیتے ہیں، حالانکہ وہ علم ریاضی کے فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں، کبھی وہ لا کالج میں پہنچ جاتے، حالانکہ وہ قوت بیان سے محروم ہوتے ہیں، نہ اپنا کیس قابلیت سے پیش کر سکتے ہیں، نہ اپنا بیان صفائی سے قلمبند کر سکتے ہیں، جب وہ لکھتے ہیں، تو غلطی کرتے ہیں، تقریر کرنے میں تو ہکلاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ وقت ضائع ہوجاتا ہے اور وہ کچھ نہیں کر پاتے۔

ایسے لوگ بھی ملیں گے جو پیشہ کو خاندانی اعتبار سے حاصل کرنا چاہتے ہیں، باپ وکیل ہے تو صاحبزادے بھی وکیل بننا چاہیں گے، باپ ڈاکٹر ہے تو فرزند دلبند بھی ڈاکٹری کے پیچھے دوڑیں گے، باپ انجنیر ہے تو کیونکر ممکن ہے، بیٹا

انجینیر بننے کی آرزو اپنے دل میں نکال دیتا ہے؟ لیکن کیا یہ مناسب ہے کہ طبیعت کو مناسبت ہو یا نہ ہو، مگر باپ کے نقش قدم یا خاندان کی روایات کی پیروی ضروری کی جائے۔

ماحول اور سماج

ہم مانتے ہیں، ماحول، سماج، اور گھر کا بڑا اثر ہوتا ہے، وراثت بھی اثر سے خالی نہیں ہوتی، یہ بھی صحیح ہے کہ الولد سر لابیہ لیکن ہم غلطی کریں گے، اگر فرد، اور ذات کے شخصی رجحان اور میلان کو نظر انداز کر دیں گے، اور اس راستے پر چلنے دیں جو اسے منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے، یہ وہ منزل ہے جو اس کے لئے کشش نہیں رکھتی، ہاں یہ ضرور ہے، یہ منزل ہے اس کے والد کے لئے کچھ معنی رکھتی تھی، یہ صحیح ہے کہ باپ کی قدرۃً یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے تجربوں، اور مشاہدوں سے اپنے بیٹے کو بہرہ ور کرے اگر وہ پریس مین ہے، یا تاجر کتب ہے، یا کسان ہے، یا کاریگر ہے یا تاجر ہے تو اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بیٹا اس کا جانشین بن جائے، اور اس بنیاد کو اور اونچا کر دے، جو اس نے خود اپنی ساری عمر میں تیار کی ہے، اگر بیٹے کو باپ کے کام سے دلچسپی ہے، تو بلاشبہ وہ اپنے باپ کی گوشہ نشینی کے بعد اس کا فوراً جانشین بن جائے گا اور اس کے تجارت و مشاہدات سے پورا پورا فائدہ اٹھائے

گا. لیکن ہر ایک کے لئے یہ ضروری نہیں، بہت سے نوجوان ایسے بھی ہیں جو اس راستے پر چل کر اپنی زندگی تباہ کر لیتے ہیں۔ وہ ایسے کام کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جس سے انہیں طبعی رغبت نہیں ہوتی، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ مثلاً باپ تاجر ہے اور وہ خوب کما کر مر گیا، اس کی گدّی پر بیٹا بیٹھا، جسے تجارت سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، تو چند ہی دنوں میں جمی ہوئی تجارت کو غارت کر کے رکھ دے گا، اور ٹکے ٹکے کو محتاج ہو جائے گا، کیونکہ اس میں وہ صلاحیت نہیں جو اس کے باپ میں تھی، اس لئے وہ وقت سے پہلے ماندا ہو جاتا ہے دوسروں پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے لگتا ہے اور آخرکار سب کچھ کھو بیٹھتا ہے، پونجی بھی اور تجارت بھی، انجام؟ ناکامی اور نامرادی۔

معلم کی حالت

جب ہم معلمین پر ایک نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں محسوس ہوتا ہے، کہ ان حضرات کا بڑا طبقہ، نہ تعلیم سے دلچسپی رکھتا ہے، نہ تدریس سے، ان میں سے اکثر نے یہ پیشہ محض ایک روزگار کے طور پر حاصل کیا ہے، انھوں نے انجنئرنگ، ڈاکٹری، اور بیرسٹری کا پیشہ دشوار سمجھ کر چھوڑ دیا اور معلمی کا پیشہ آسان سمجھ کر اختیار کر لیا، انھوں نے اپنے فن میں کمال حاصل نہیں کیا، بے دل

کے ساتھ محض ایک ذریعہ روزگار سمجھ کر اختیار کرلیا۔

طلبہ کا حال مدرسین سے بدتر ہے، اگر ہر آدمی اپنے صفات عقلی و جسمی کے لحاظ سے اپنا پیشہ منتخب کرے تو وہ خود بھی کامیاب ہو اور قوم کو بھی فائدہ پہنچے، لیکن ثانوی مدارس سے فراغت کے بعد، طالب علم سوچتا ہے کہ اکتساب فن یا حصول علم کا ادب وہ جو راستہ اختیار کرے، وہ مختصر ترین ہو اور فراغت کے فوراً بعد اس کا پھل بھی مل جائے، اگرچہ انہیں عسکری زندگی سے لگاؤ نہیں ہوتا، فوج میں اندھا دھند جو نوجوان بھرتی ہوتے ہیں، ان کے اس اقدام میں حب وطن کا اتنا جذبہ نہیں ہوتا، جتنا یہ کہ نفع فوراً ہو اور کسب و اکتساب کی مدت کم سے کم ہو۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک طالب علم کا ڈاکٹری کی طرف رجحان ہے لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ڈاکٹری کی تحصیل میں مدت زیادہ لگے گی، تو وہ اس لائن کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے، جو اگرچہ مختصر ہوتا ہے، لیکن اس کی طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتا، طالب علم کو اپنا پیشہ منتخب کرنے کے سلسلے میں ہمیشہ اپنے امیال و عواطف کا خیال رکھنا چاہیئے اگرچہ حصول مقصد میں کتنی ہی دیر کیوں نہ لگے، اور کیسی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں، تاکہ اپنی استعداد سے وہ خود بھی

فائدہ اٹھا سکے، اور اپنے وطن کو بھی قرار واقعی فائدہ پہنچا سکے، اور اگر وہ اپنے ذوق و میل کے خلاف کسی دوسرے کالج کو منتخب کرتا ہے، تو اگرچہ ممکن ہے کہ وہ امتحان میں کامیاب ہو جائے، لیکن سود مند نہیں بن سکتا، کسی کے لئے بھی : اس کی عملی زندگی اکارت جائے گی۔ یہ جو صورت نظر آتی ہے، کہ صاحب نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا، لیکن ایڈیٹری کر رہے ہیں، ڈاکٹری کسی نہ کسی طرح ڈگری حاصل کر لی، لیکن حکومت کے سکریٹریٹ میں ملازمت کر رہے ہیں، کامرس کے امتحان میں کامیاب ہو گئے، لیکن کلرکی کر رہے ہیں، یہ اس لئے ہوتا کہ شروع میں بغیر سوچ سمجھے ان کا پیشہ منتخب کر لیا جاتا ہے، اور بعد میں پھر نئے نئے تجربے کئے جاتے ہیں اور ٹھوکریں کھائی جاتی ہیں، طالب علم کو حصول روزگار کے لئے جذبہ سے بلند ہو کر اس طرف اپنے ذہنی اور طبعی رجحان کے مطابق اپنی منزل مقصود متعین کرنی چاہیئے، تاکہ وہ عملی زندگی میں کامیاب ہو سکے، اور اس کی عملی زندگی دوسروں کے لئے باعث عبرت نہ ہو، بلکہ باعث رشک و تقلید ہو ہمارے ہاں جو بڑے بڑے لوگ کم پیدا ہوتے ہیں اس کی وجہ بھی کوتاہی ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ کوئی کامیاب تاجر، شعلہ مقال خطیب، سحر نگار انشار پرداز، ماہر کسان، محنتی مزدور، یکتائے روزگار، نقاش اور مصور بلند پایہ، وکیل، عالم اور ڈاکٹر نہ پیدا کر سکیں۔

ضرورت صرف اس کی ہے کہ طلبہ کو اُس کی پوری آزادی ہو کہ وہ صرف وہی راستہ اختیار کریں جو ان کے مزاج اور طبیعت کے موافق ہو۔

بچہ اور زبردستی

بچہ کو جبراً مدرسہ میں نہیں داخل کرنا چاہئے بلکہ اس میں شوق، اور رغبت پیدا کرنا چاہئے، جب وہ جوانی کی سرحد میں قدم رکھے اور زندگی کا سب سے کٹھن مورچہ یہی ہوتا ہے، تو لازم ہے کہ اسے بغیر رہنما کے تنہا نہ چھوڑا جائے گا۔ یہی وقت ہوتا ہے کہ اگر ذرا چوک ہوئی اور وہ ہاتھ سے گیا، اور پھر وہ کسی طرح قابو میں نہیں آتا، اور اس کی عملی زندگی رائیگاں ہو جاتی ہے ہر سال اسکول اور کالجوں سے بہت بڑی تعداد طلبہ کی فارغ ہو کر نکلتی ہے، تربیت عملی کا صحیح وقت اب شروع ہوتا ہے، اگر صحیح تربیّت کی جائے، تو ان میں سے بہتوں کو ایسا بنایا جا سکتا ہے کہ وہ عملی طور پر زراعت کریں۔ منظم طور پر تجارت کریں۔ ماہرانہ طور پر صنعت و حرفت کا کام کریں، لیکن اکثر عملی تربیت سے بے بہرہ ہوتے ہیں، اور وہ ان کے ذرا کام نہیں آتا۔

جنگ عظیم کے اختتام کے بعد ایسے حالات پیش آئے ہیں۔ جنھوں نے ہمیں چونکا دیا ہے اور حالات نے تیزی کے ساتھ انقلاب پیدا کر کے ہمیں سوچنے اور غور کرنے پر

مجبور کر دیا ہے ، کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ ایک شاندار قوم ہونے کے باوجود ہم ایک سوئی تک نہیں بنا سکتے ؟ ہمارے پاس کپڑا بنانے کی کوئی مل نہیں ہم شیشہ سازی کے فن تک سے ناواقف ہیں ہم دوائیں نہیں بنا سکتے . آلات نہیں تیار کر سکتے ، ان تمام چیزوں میں ہم بغیر ممالک کے محتاج ہیں ، اور صرف اس لئے محتاج ہیں کہ عملی تربیت سے بے بہرہ ہیں . اگر ہم میں یہ چیز ہی پیدا ہو جائے تو بڑی آسانی سے ہم اپنے وطن کو خود کفیل بنا سکتے ہیں .

ہمارے پاس مدارس کی کمی نہیں اور اس نعمت پر ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں ، خدا کرے ان میں اور اضافہ ہو ، علم اور تعلیم کی طرف سے زیادہ سے زیادہ رغبت پیدا ہو لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف مدرسوں کی کثرت ہی اصل مقصد نہیں ہے ضرورت اس کی ہے کہ یہ مدرسے طلبہ میں ، عملی جوہر پیدا کریں اور انہیں عملی زندگی کے لئے تیار کریں ، معلموں کا فرض ہے کہ دیکھیں ان کی قوم اور وطن کی ضرورت کا تقاضہ کیا ہے ؟ اور اس تقاضے کو پیش نظر رکھ کر وہ اپنے تلامذہ کو تیار کریں ، سولون کا قول ہے " دیکھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ قوانین کتنے اچھے ہیں ، اور کتنی اچھی طرح ہم ان پر عمل کر سکتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ قوم کے مزاج کے موافق ہوں اور وہ قوم میں انہیں ماننے کی صلاحیت و قبولیت پیدا کریں ؟ ہر کام حکومت ہی کا

نہیں ہوا کرتا، کچھ ہمارا کام بھی ہے، کچھ ہمارے دولت مندوں کا بھی ہے ہم کہاں تک اپنا کام کرتے ہیں، ہمارے سرمایہ دار کہاں تک اپنا کام کرتے ہیں یہ بھی تو سوچنا چاہیئے اگر ہمارے سرمایہ دار ملیں کھولتے، کارخانے قائم کرتے، تو ہمارے نوجوان تعلیم سے فارغ ہو کر ان کی طرف لپکتے، اپنے روزگار اور قوم کے لیئے، ضرورت کی چیزیں پیدا کرتے، اور اس طرح ان کی عملی زندگی کامیاب تر ہو جاتی۔

عقل اور زندگی

بہت دنوں کی بات ہے، انگلستان کے کابینۂ وزارت کے ایک رکن نے اپنے ملک کے دولت مندوں کو للکارتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمارے دولت مندوں کے جسم توانا ہیں، عقل منظم اور مرتب ہے، بایں ہمہ ان کی زندگی یکسر جمود اور تعطل ہے، وہ اپنے اوقات بیکار ضائع کرتے ہیں، بجائے اس کے کہ دنیا کے سامنے اپنے عمل نافع کا کوئی نمونہ پیش کریں، وہ اپنا وقت سیر سپاٹے میں صرف کرتے ہیں اور جو کچھ کر سکتے ہیں وہ نہیں کرتے، حالانکہ وہ اپنی دولت سے ہر چیز خرید سکتے ہیں"

ہمارے دولت مندوں کا آج بھی یہی عالم ہے، اُن کی زندگی معطل ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں سے قوم اور ملک کو فائدہ نہیں پہنچاتے، نہ وہ کوئی ایسا کام کرتے ہیں جن سے اُن کا نام

ہمیشہ زندہ رہے ، دن کو سوتے ہیں اور رات کو مٹر گشت کرتے ہیں ، اپنی دولت پر گھمنڈ ہے ، نہیں جانتے کہ قوم کو ان کی ضرورت ہے ، اُن کے روپے کی بھی اور خود ان کی بھی ، وہ ان کے عِلم کی محتاج ہے اگر وہ عالم ہوں ، ان کی رائے کی محتاج ہے ، اگر وہ مدبر ہوں ، ان کے ادب کی محتاج ہے ، اگر وہ ادیب ہوں ، قوم ہر فرد سے خواہ وہ کسی طبقہ سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو - کچھ توقعات رکھتی ہے ، اور انہیں بہر حال پورا ہونا چاہیئے ، خواہ وہ غریب ہو یا امیر ، شریف ہو یا رذیل ، ہر دولت مند ناکارہ ہو یہ بھی نہیں ہے ، ان میں ایسے بھی ملیں گے جو بات کے دھنی ہیں ایسے بھی ہیں جو کردار کے اونچے ہیں ، اپنے علم اور عمل میں دیانت دار بھی ہیں ، لیکن سُست اور کاہل ہیں ، اپنے وجود اور قوم کے مفاد سے غافل اور بے خبر ہیں ، ترقی یافتہ قوموں اور ملتوں میں کوئی شخص بھی بیکار اور کاہل نہیں ملے گا ، سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں ۔

عملی تربیت

عملی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ بچوں کو شروع ہی سے کسی خاص ڈھرّے پر نہ لگا دیا جائے بلکہ آغاز میں زور صرف ان کی نشو و نما پر دیا جائے ، انھیں بتایا جائے کہ کس طرح پڑھیں کس طرح باتیں کریں ؟ کس طرح سوچیں ؟ کس طرح علم کو عمل سے مربوط کریں ؟ اور کس

طرح زندگی بسر کریں؟ ۱۶-۱۷ برس کی عمر تک لڑکے کو عام تعلیم دینا چاہئے۔ اس کے بعد اسے موقع دینا چاہئے، کہ وہ اپنے ذوق اور رجحان کے مطابق اپنے لئے کوئی کام پسند کرے، بعض آبا اپنی مالی کمزوریوں کے باعث یہ چاہتے ہیں کہ تعلیم کا نتیجہ روزگار کی صورت میں فوراً ظاہر ہو جائے، وہ اسے بھول جاتے ہیں کہ تربیت کی مثال کھیتی کی سی ہے، پہلے زمین ہموار کیجئے، پھر بیج ڈالئے پھر سیراب کیجئے، تب فصل کاٹئے، یہی مرحلے لڑکے کی زندگی میں بھی پیش آتے ہیں، ان سے گزرے بغیر چارہ نہیں۔

گھر، مدرسہ، اور سوسائٹی میں طلبہ کی تربیت اس طرح ہونی چاہئے کہ وہ ایک نظام کے خوگر ہو جائیں؛ حسن معاملت ان کا جوہر بن جائے، فرض کے ادا کرنے کا احساس ترقی کر جائے جماعت کے ساتھ تعاون کی عادت پڑ جائے۔ مصائب کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہو، اپنی ذات اور اپنی کارکردگی پر اعتماد ہو، یہاں تک کہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ اپنی عقل سے کام لے سکیں، اپنے ہاتھ سے بوجھ اٹھا سکیں، اپنی عملی زندگی میں کامیاب ہوں، اپنے اپنے خاندان، اور وطن کے کام آئیں، ان کی رائے جچی تلی ہو، ان کی عقل پختہ ہو

(۱۷)

تربیتِ خلقی

اور

اس کے محرّکات و عوامل

مارٹن لوتھر مشہور جرمن معلّم کا قول ہے :۔ "کسی قوم کی کامیابی اور سربلندی کا راز یہ نہیں ہے کہ اس کی تعداد کتنی ہے ؟ اس کے قلعے مضبوط ہیں ؟ بلکہ اس کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس قوم کے بیٹے علم اور اخلاق کی تربیت سے کس حد تک بہرہ ور ہیں ؟"

مانٹ جرمنی کے مشہور فلسفی کا قول ہے کہ : "ارادہ اور اخلاق میں بڑا گہرا تعلق ہے ، اگر ارادہ اچھا ہے تو اخلاق لازمی طور پر اچھا ہوگا ، اور اگر ارادہ نادرست ہے تو اخلاق بھی درست نہیں ہو سکتا !"

لیکن ہمیں یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اطفال کے طبائع اور

میلانات میں اختلاف ہوتا ہے، اگر ان کے اخلاق پر نظر ڈالی جائے تو بعض کھرے، اور سخت نظر آئیں گے، بعض شرمیلے ہوں گے، کسی میں سخاوت ہوگی، کسی میں بخل، کوئی رحمدل ہوگا، کوئی سنگ دل فرق طبائع کا فرق ہے، یہ سب ایک درجہ میں نہیں رکھے جا سکتے، ان میں نیک، بار، شریف، شریر سب ہی قسم کے ہیں، اگر ان کی تربیت نہ ہو، یا ناقص ہو۔ تو یہ سب کے سب تباہ ہو جائیں گے۔ ماں باپ کا خاص طور پر فرض ہے کہ وہ بچہ کی اخلاقی تربیت کو کسی وقت بھی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں، کیونکہ قومیں دولت و ثروت، قلعے اور چھڑکی سے نہیں بنا کرتیں، وہ بنتی ہیں علم اور اخلاق سے، شوقی بک نے کیا خوب کہا ہے۔

"کسی قوم کا اگر اخلاق خراب ہے، تو وہ جڑ نہیں پکڑ سکتی"

تربیت خلقی کا مقصد

تربیت خلقی کا مقصد حسن سلوک اور حسن اخلاق سے زندگی کے ہر دور میں، اور ہر مرحلہ پر، خواہ وہ گھر ہو، مدرسہ ہو لیبارٹری ہو، سوسائٹی ہو، کچھ ہو، اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں کیا جا سکتا جب تک بچہ میں یہ تمیز نہ پیدا ہو جائے کہ وہ برائی اور اچھائی، خوب و زشت میں پرکھ کر سکے۔

جان لوک کے اصول

انگلستان کے مشہور ماہر فن تربیّت واخلاق، اور فلسفہ و مذہب جان لوک نے حسب اہمیت چند اصول اس سلسلے میں ترتیب دیئے ہیں اور علوم کو سب سے آخیر میں رکھا ہے۔

پستا کوزی کا کہنا ہے کہ تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہے جو نامعلوم ہے وہ معلوم ہو جائے، بلکہ یہ ہے کہ آداب اخلاق، اور حسن معاملت کا جوہر پیدا ہو جائے۔

فروبل نے اپنی کتاب "تربیت انسانی" (Education of man) میں لکھا ہے کہ تربّیت کا مقصد اچھی زندگی کا پیدا کرنا ہے جو پاک ہو، اور مقدّس ہو، جس میں اخلاص ہو اور پاکیزگی ہو۔

ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ تربّیت کا جزوی و کلی مقصد یہ ہے کہ انسان میں "فضیلت پیدا ہو جائے۔

مدرس کو چاہیئے، کہ وہ ہمیشہ یہ یادرکھے کہ ہمارے لئے صرف علم ہی کافی نہیں ہے، علم سے زیادہ ہمیں اخلاق کی ضرورت ہے، اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح پرہیز علاج سے بہتر ہے، طب اور اخلاق دونوں کا یہ اصول بنیادی طور پر ایک ہے۔

تربّیت خلقی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تلمیذ کے سامنے ہم

تربیّت خلقی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تلمیذ کے سامنے ہم اخلاق کے فضائل و مناقب پر دھواں دھار لکچر دے ڈالیں اور اس کی بُرائی کے خلاف ایک زوردار تقریر کر دیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ تلمیذ کے دِل میں ایسے تاثرات رچ جائیں کہ وہ خود اخلاق کی اہمیت محسوس کرنے لگے، یہ کام مدرسہ کے درجہ میں کھیل کے میدان میں ہر جگہ ہو سکتا ہے، اخلاق کی تربیّت میں عمل ،نمونہ بہت کام دیتا ہے۔

افلاطون سے سوال

ایک مرتبہ افلاطون سے پوچھا گیا کیا تم "فضیلت" کی تعلیم دے سکتے ہو؟ اس نے جواب دیا۔ نہیں!، اس انکار کا مقصد یہ تھا کہ فضیلت یعنی تربیت اخلاق پڑھی نہیں جاتی، حاصل کی جاتی ہے، عمل سے اور ارادہ کی پختگی سے، بشرطیکہ طبیعت اس طرف مائل ہو، ارادہ، عقل اور رجحان کا مکمل تعاون حاصل ہو۔

ایک اور فلسفی سے بالکل یہی سوال کیا گیا، اس نے کہا "ہاں، میں فضیلت کی تعلیم دے سکتا ہوں!" اس کی اثبات کا مقصد یہ تھا، کہ بعض لوگ اپنی ناواقفیت سے غلطی کرتے ہیں وہ ایک بُرا کام کرتے ہیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہ بُرا ہے۔ ایسے لوگوں کو فضیلت یعنی پاکیزگی اخلاق کی تعلیم دی جا سکتی ہے، لیکن یہ اس وقت ہو سکتا ہے، جب طبیعت میں

اصلاح قبول کرنے کا مادہ اور رجحان ہو، طبیب اسی وقت دوا دے گا، جب دیکھ لے گا، ہاں مرض ہے، سمجھ دار ماں بچّہ کو اسی وقت کھانا دے گی، جب دیکھ لے گی۔ ہاں اسے واقعی بھوک لگی ہے، ہر مدّرس کے لئے ضروری ہے کہ وہ علوم کے ساتھ ساتھ اخلاق کا بھی معلّم ہو۔

تربیت اخلاق پر دین اسلام نے بہت زور دیا ہے اور اس کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کیا ہے، اللہ نے اپنے نبی کریم کو مخاطب کرکے فرمایا ہے "وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیم" خود سرور کائنات کا ارشاد ہے "ادبنی ربی فاحسن تادیبی وامرنی بمکارم الاخلاق" ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ عہد حاضر میں سب سے زیادہ توجہ طلب جو چیز ہے وہ یہی اخلاق ہے اس کے نظر انداز کر دینے کے بعد، کچھ بھی نہیں رہ جاتا، بغیر اس کے نہ فرد بن سکتا ہے، نہ قوم،

مہذب آدمی

سوال کیا جاتا ہے، مہذب آدمی کی پہچان کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے وہ شخص جو غم عظیم سے زیادہ متاثر نہ ہوتا ہو، جو دوسروں کے راحت و آرام کا خیال رکھتا ہو، بات کی جائے تو غور سے سُنے کسی حادثہ سے دل خستہ نہ ہو، جس سے دشمنی ہو اس کا لاگو نہ ہو جائے، جب مشورہ لیا جائے، صحیح مشورہ دے، جس میں

شرافت اور نزاکت احساس کا مادہ ہو، جو اپنی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے نہ ملاتا ہو، نہ چغل خور ہو، نہ بکواس کا عادی، بس وہی مہذب آدمی ہے۔

مہذب آدمی عدل و انصاف کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا، شر کی طرف کبھی مائل نہیں ہوتا، نہ محبت میں مبالغہ کرتا ہے، نہ دشمنی میں انتہا کو پہنچتا ہے، ممکن نہیں کہ وہ برائیوں کا ذکر کرے اور اچھائیوں کو بھول جائے، وہ کسی پر حسد نہیں کرتا ناگوار باتوں کو گوارا کر لیتا ہے، غم کی پروا نہیں کرتا کہ اس سے کسی کو مفر نہیں، موت سے گھبراتا نہیں کہ وہ بہر حال آنی ہے۔

ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ اپنے شاگردوں، اور بچوں کو مہذب بنائیں، افراد کو اگر ہم مہذب بنالیں، ان کی خلقی ترتیب صحیح اصولوں پر کریں، ان میں اخلاق فاضلہ پیدا کریں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے پوری سوسائٹی کو مہذب بنا لیا اور اس میں ہمت کی بلندی، خیر سے رغبت اور شر سے نفرت، ارادہ اور عمل کی قوت، فکر و نظر کی وسعت، قلب کی پاکیزگی، حسن معاملت، غرض تمام اچھی اور صالح باتیں پیدا کر دیں۔

مشہور فلسفی جان ڈیوی نے اپنی کتاب "جمہوریت اور تربیت میں لکھا ہے: "عقل اور اخلاق میں ہم وعظ و پند

سے اصلاح نہیں کر سکتے، یہ اصلاح اس وقت ممکن نہیں، جب تک صناعی اور سیاسی احوال میں تغیر نہ کر دیا جائے! اپنی ایک دوسری کتاب "اخلاق" میں اس نے لکھا ہے" اخلاق کی ان مختلف رغبتوں کا مجموعہ ہے جو انسان کی طبیعت بن جاتی ہیں اور اسے کسی کام کے کرنے پر ابھارتی ہیں!" ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اخلاق ان میلانات کا نام ہے جو سوسائٹی کی تحسین و تکمیل میں مددگار ہوتے ہیں.

اخلاق کی تکوین

اخلاق ایک ایسی چیز ہے، جس کی تکوین و تعمیر ماں کی گود سے لے کر آغوش قبرستان تک جاری رہتی ہے، بچپن، جوانی، بڑھاپا، ہر دور میں اس کے صورت پذیر ہونے کا سلسلہ جاری رہتا ہے. یا یوں سمجھنا چاہیئے، انسان جب تک زندہ ہے اس کی تربیت بھی ہو سکتی ہے، اور تعلیم بھی، زندگی کے ان مختلف ادوار میں سب سے کڑا اور کٹھن دور بچپن اور جوانی کا ہے اس دور میں اچھی یا بُری عادتیں جڑ پکڑ لیتی ہیں، اور پھر ان میں تبدیلی بہت مشکل سے ہوتی ہے

ڈ

(۱۸)

تربیت خلقی

اور

اس کے اساسی و بنیادی عوامل

خلق تربیت کے بنیادی عوامل حسب ذیل ہیں۔

گھر یہیں سے اخلاق کا اٹھان شروع ہوتا ہے، یہیں اخلاق کی بنیاد پڑتی ہے، اگر بنیاد مضبوط پڑتی ہے تو عمارت ضرور مضبوط ہوگی، جن لوگوں کو یہ خیال ہے کہ گھر کی تربیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی، وہ مغالطہ میں مبتلا ہیں نہیں جانتے کہ بچہ بڑا نقال ہوتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے اس کی نقل کرنے لگتا ہے سب سے پہلے وہ ماں باپ اور بھائی بہن کو دیکھتا ہے، اور بڑی آسانی سے ان کا چلن اختیار کر لیتا ہے، یہ لوگ اگر اچھی باتیں اور اچھے کام کرتے ہیں تو بچہ بھی ویسا ہی بن جاتا ہے۔ ورنہ برعکس، اگر گالم گلوچ سنے گا، تو خود بھی گالیاں بکنے لگے گا

میل محبت کی باتیں دیکھے گا، تو خود بھی یہی کرنے لگے گا، لڑتے جھگڑتے دیکھا، تو خود بھی دنگئی اور لڑاکو بن جائے گا، غرض وہ اچھی یا بُری جس قسم کی تربیت خلقی حاصل کرے گا، اس کا پہلا مرکز گھر ہی ہوگا۔

مدرسہ

بچہ جب مدرسہ میں جاتا ہے، تو کبھی کبھی اخلاقی جراثیم اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے اور مدرسہ ان چیزوں پر چنداں توجہ نہیں کرتا، اور مدرسین کو اس کے سوا کوئی فکر نہیں ہوتی کہ بچہ کس طرح امتحان میں کامیاب ہو جائے اور اخلاق؟ سو اس کی ان کے نزدیک کوئی خاص منزلت نہیں، وہ اگر اخلاق میں کجی دیکھتے ہیں تو اس کے درست کرنے کا انہیں خیال بھی نہیں آتا۔

مدرس اگر چاہے تو وہ اوقات درس میں بھی بچوں کے اخلاق کی نگرانی اور اصلاح کر سکتا ہے، بلکہ یہ اس کا فرض ہے اس سلسلہ میں جو کوتاہی اس کی ذمہ داری جتنی مدرسہ اور مدرس پر ہوتی ہے بالکل اتنی ہی والدین اور گھر پر بھی ہوتی ہے جب تک دونوں میں تعاون نہ ہو خلقی تربیت مکمل نہیں ہو سکتی۔

کھیل کا میدان

ایک لائق اور ذہین مدرس کے لئے کھیل کا میدان، بچوں کی بہترین تربیت گاہ بن سکتا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ اکسکرشن پر جو جاتے ہیں، یہ

تربیت خلقی کا بہترین وسیلہ ہے۔ لوگ یہ تو مانتے ہیں کہ کھیل کا میدان جسم کی بہترین تربیت گاہ ہے لیکن یہ نہیں مانتے کہ یہاں اخلاق بھی بنائے جا سکتے ہیں، یہ ان کی غلط فہمی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ کھیل کے میدان میں کودنے کے بعد بچہ بہت کچھ سیکھتا ہے، صبر، استقامت، تحمل میں برداشت، رفاقت تعاون، بے غرضی، اطاعت، ضبط و نظم، یہ سب چیزیں جلتنے بہتر طور پر کھیل کے میدان میں حاصل ہوتی ہیں کہیں اور نہیں حاصل کی جا سکتیں۔

سوسائٹی سوسائٹی ماحول اور حلقۂ احباب کا بھی اخلاق کی تعمیر و تکوین پر بہت گہرا اور اچھا اثر پڑتا ہے اگرچہ سوسائٹی اچھی ہے تو بچے کے اخلاق پر اچھا اثر پڑیگا اگر بُری ہے تو پھر کسی طرح بھی بچہ اچھا نہیں رہ سکتا۔

اخلاق کی تربیت کے سلسلہ میں سب سے پہلے جو بات ذہن نشین کرنی چاہیئے، وہ یہ ہے کہ اخلاق کی تربیت زیادہ کارآمد اور مؤثر بچپن ہی میں ہوتی ہے۔ بچہ جوں جوں بڑھتا جائے گا، اس کی عادتیں جڑ پکڑتی جائیں گی۔ پھر انہیں توڑنا یا موڑنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ معلم کو متعلم کے دل میں یہ بات بٹھا دینی چاہیئے کہ حسنِ اخلاق ہی کامیابی اور کامرانی کا واحد ذریعہ ہے اور وہ زندگی کسی کام کی نہیں ہے جو اخلاق فاضلہ سے خالی اور عاری ہو۔

(۱۹)

اخلاق

کے

فطری انفعالات اور تاثرات

ڈیکارٹ نے عالم کی دو قسمیں کی ہیں۔

(۱) عالم مادّی

(۲) عالم روحی

اس تعلیم سے اندازہ ہوتا ہے کہ غایت اور وسیلہ اسباب اور نتائج میں تناقض ہوتا رہتا ہے اور یہ تناقض اسی تقسیم (روحی) (مادی) کا نتیجہ ہے۔

اخلاق اور عمل جان ڈیوی کا خیال ہے کہ اخلاق ایک نفسی اور داخلی امر ہے۔ یہی انسان کو عمل کے لئے اُبھارتا ہے اور آمادہ کرتا ہے، عمل ہی کا دوسرا نام سلوک ہے، پس ثابت ہوا انسان کا اخلاق وہی ہے جو سوسائٹی

اور عمل کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ اگر آپ کسی انسان کو دیکھیں گے تو اخلاق سے پہلے اس کے عمل پر نظر پڑے گی، زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے، اخلاق سلوک (عمل) پر اثرانداز ہوتا ہے لہذا، اخلاق مسبب ہے اور سلوک یا عمل، سبب یا نتیجہ ہے

سلوک و عمل، درحقیقت اخلاق کا جز ہے، بلکہ اسے سرتاپا اخلاق بھی کہہ سکتے ہیں، یعنی اخلاق وسلوک درحقیقت ایک مسمی کے دو نام ہیں۔

بچہ میں فطری انفعالات اور تاثیرات کے ماتحت چند چیزیں پیدا ہوتی ہیں، وہ ڈرتا ہے، اس کے چہرے پر غصہ کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں، کوئی گیند کھیلنے سے منع کرے تو اس سے جھگڑ پڑتا ہے، یہ سب باتیں اسی وقت رونما ہوتی ہیں جب انفعال و تاثر پوری شدت کے ساتھ کارفرما ہوں، اس وقت وہ انجام پر نظر نہیں کرتا، بچہ کی تربیت اخلاق و عمل میں عادات فطری کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے اور اس کو اسی وقت قابو میں لایا جا سکتا ہے، جب تربیت صحیح اصولوں پر ہو۔

انسان انفعال و تاثر کے عالم میں بہت سی غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے جن کا نتیجہ ندامت اور شرمندگی کی صورت میں رونما ہوتا ہے، کیونکہ ایسے وقت جو کچھ کرتا ہے، جذبات کے ماتحت کرتا ہے۔ عقل سے متاثر ہو کر نہیں، لہذا جو کچھ اس سے

سرزد ہوتا ہے، بلا سوچے سمجھے اور اگر وہ کرنے سے پہلے سوچ سکے تو غلطی نہ کرے، اور ندامت کا موقع نہ حاصل ہو، اور اگر انسان ایسا کر سکے، تو بہت سے مواقع پر اُسے ندامت اور شرمندگی سے نجات مل جائے۔

انسان کو غصہ اسی وقت آتا ہے، جب وہ کوئی صدمہ یا اذیّت محسوس کرتا ہے، جیسے زخمی شیر، وہ لکڑی اور پتھر بلکہ اپنا زخم تک غصہ میں چبا ڈالتا ہے، کتّے کے آگے سے ہڈی اُٹھالی جائے، بھنبھوڑ کھائے گا، بچّہ سے کھیل چھین لیا جائے مچل جائے گا، مصنّف کی کتاب پر ایک تنگ نظری، حسد، یا جہل کے ماتحت نقد وتبصرہ کیا جائے، تو وہ جلبلا جائے گا۔

عمل پر وجدان کا اثر

بعض علمائے علم النفس کا خیال ہے کہ عمل کی بنیاد وجدان ہے یہی وہ قوی ترین شعور ہے، جو انسان کو خیال سے عمل کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ لیکن ان علمائے علم النفس نے فکر و ارادہ کی قوّت کو نظرانداز کر دیا ہے، حالانکہ اِن دونوں کا بھی عمل پر براہِ راست بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔

اور سچّی بات تو یہ ہے کہ عمل فکر وارادہ دونوں کا محتاج ہے۔ وجدان، فکر وارادہ کے درمیان رابطہ کا کام دیتا ہے۔

ہم مانتے ہیں، وجدان عمل پر اثر انداز ہوتا ہے، لیکن ہم اسے

نہیں مانتے کہ سلوک و عمل تمام تر وجدان ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

عمل کے بارے میں کانٹ کی رائے

کانٹ کا خیال ہے کہ سلوک کی اساس و بنیاد ارادہ ہے، انسان کے سامنے ایک ہی وقت میں دو غور طلب باتیں آتی ہیں، وہ دونوں پر غور کرتا ہے، دونوں کے نتائج سوچتا ہے اور پھر کوئی ایک پہلو لے کر عمل کے لیے کھڑا ہوتا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ عمل ارادہ کا نتیجہ ہے۔ ایک سگرٹ نوش اپنی صحت پر سگرٹ نوشی کا بُرا اثر محسوس کرتا ہے، سوچتا ہے کہ اسے چھوڑ دینا چاہئے، پھر چھوڑ دیتا ہے، یہ ترک ارادہ کے سوا کس کا نتیجہ ہے؟

ہم ارادہ کی اثر انگیزی کے مُنکر نہیں ہیں، لیکن صرف اسی کو اصل اور اساس نہیں قرار دیتے، جس طرح عمل پر ارادہ صرف ایک وسیلہ ہے، ہمارا خیال ہے حسنِ اخلاق نتیجہ ہوتا ہے ارادہ کی اچھائی کا لیکن ارادہ کی اچھائی، حسن اخلاق کو مستلزم نہیں ہوتی، بہت سی ایسی خطائیں بھی ہیں جو انسان ارادہ اور نیت کی اچھائی کے ساتھ کر گزرتا ہے، کیا ہم نیت اور اردہ کی اچھائی کے سبب ایک برے کام کو اچھا سمجھ لیں گے؛ لہٰذا نہ ہم کانٹ کے اس قول کو مانتے ہیں کہ ارادہ ہی عمل کی بنیاد ہے، نہ ہم ڈیکارٹ کے اس اصول کے قائل ہیں کہ وجدان ہی عمل کا محرک ہے، اصل بات یہ ہے کہ اخلاق کی بنیاد، فکر، وجدان، اور ارادہ تینوں پر ہے انسان کی

حیات نفسی کے یہ تینوں مظاہر ہیں، !

عمل کی بنیاد: فکر

بعض قدیم فلاسفہ کا خیال ہے کہ فضیلت کا دوسرا نام عقل ہے، اور رذیلت کا دوسرا نام جہل ہے، انسان سے کبھی غلطی ہو جاتی ہے اور وہ رذیل کر بیٹھتا ہے، یہ غلطی ناسمجھی کا نتیجہ ہوتی ہے، لہذا عمل و سلوک، اور اخلاق کی اصل بنیاد عقل ہے، سقراط کا خیال ہے کہ انسان سے جب غلطی ہوتی ہے، اور وہ کسی رذیل حرکت کا ارتکاب کرتا ہے، تو اس کا سبب جہالت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، ایک دوسرے فلسفی کا خیال ہے کہ فکر، ذکاوت، اور عقل، بھی فضائل کا لہ کی بنیاد ہیں، کیونکہ انسان سے کوئی رذیل حرکت اس وقت تک سرزد نہیں ہو سکتی، جب تک وہ اپنی طبیعت کو مطلق العنان نہ چھوڑ دے، اور عقل و فکر کی طرف سے منہ نہ موڑے، اس رائے کو اگر مانا جائے، تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خلق کا اعلیٰ درجہ اس وقت تک حاصل نہیں کیا جا سکتا، جب تک قدرت کی طرف سے ذکاوت اور عقل بہت زیادہ نہ ملی ہو، لیکن کیا یہ بات صحیح ہے؟ کیا یہ بات سچ ہے؟ کہ صاحب فکر و ذکاوت طبقہ کے سوا، اخلاق کہیں نہیں ملتا؟ کیا یہ بات درست ہے کہ ایک عالم آدمی جو فلسفہ، طبعیات، کیمیا وغیرہ کی الف بے بھی نہیں جانتا، اخلاق سے محروم ہوتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ علم فضیلت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

بشرطیکہ طبعی میلان بھی اس طرف ہو، وعظ و پند کا اثر صرف صالح طبائع پر ہی ہوتا ہے، وہ عالم جو علم کے ساتھ اخلاق فاضلہ سے بہرور ہو اس جاہل سے بہتر ہے، جو صرف صاحب اخلاق ہے، لیکن ہم اُسے تسلیم نہیں کر سکتے، کہ علم فضیلت کو مستلزم ہے، اور ذکاوت حسن اخلاق کو مستلزم ہے، تکوین اخلاق کے لئے یہ ضروری نہیں، ہے کہ ہم فلاسفہ، علماء، اور مناطقہ کا درجہ، علم، فلسفہ اور منطق بس حاصل کرلیں، ہم یہ بھی نہیں کہتے، کہ سلوک صرف معرفت ہی پر منحصر ہے، یا فکر سلوک کی بنیاد ہے، بلکہ جیساکہ ہم کہہ چکے ہیں، حسن اخلاق اور حسن سلوک کے لئے فکر، وجدان، اور ارادہ تینوں چیزیں ضروری ہیں۔

---

(۲۰)

تربیت کے وسائط

خاندان اور سوسائٹی کا اثر تربیت پر

گزشتہ صفحات میں کسی مقام پر ہم بحث کر چکے ہیں کہ سوسائٹی اور ماحول کا اثر انسان کی فکر، عمل اور اخلاق پر کتنا گہرا ہوتا ہے ایک بچہّ اگر کسی گوّیے کے گھر پیدا ہوگا، تو عام طور پر یقیناً اُسے موسیقی سے زیادہ رغبت ہوگی، ایک ڈاکٹر کے لڑکے سے پوُچھیے میاں آئندہ زندگی میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ اکثر و بیشتر اس کا جواب یہی ہوگا "میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۹ء کے اخبار ڈیلی میل (لنڈن)، DAILY MAIL کی اشاعت میں میں نے ایک خبر پڑھی تھی کہ برمنگھم یونیورسٹی کی ایک طالبہ برقی انجنیرنگ کے امتحان میں سب سے اول آئی، اس شعبہ کے صدر نے لڑکی کے بارے میں کہا، کہ یہ لڑکی حلیہ، بر اپنی فکر، قوت عمل اور

قوت بحث کے لحاظ سے فوقیت رکھتی ہے، یہ ایک انجنیر خاندان کی لڑکی ہے اور اسی سال اس کے چچا زاد بھائی نے بھی اسی مضمون میں ایسی ہی کامیابی ایک دوسری یونیورسٹی سے حاصل کی ہے ان دونوں کا یہ میلان، خاندان کی تربیت اور خاندانی سوسائٹی کے اثر کا نتیجہ تھا، خاندانی سوسائٹی کا اثر بالکل غیر شعوری طور پر پڑتا ہے۔ اور بڑا گہرا ہوتا ہے، سوسائٹی سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے اور اس کا اثر بالکل مخفی ہوتا ہے،

بچہ کی سوسائٹی اگر بچہ ایسے ماحول اور سوسائٹی میں بسر کرے، جہاں اس کی تربیت فکر کے پورے سامان موجود ہوں، اس کے رزق کو مکمل کیا جائے، مدرسہ اچھا ہو، تصویریں خوب ہوں، باغ اور چمن ہو، جس میں کھیلنے کودنے کی اجازت ہو، اچھے اچھے لیکچرار اور عمدہ عمدہ گر نے سننے کو ملے ہوں، اور اگر کہیں ان چیزوں کے ساتھ ایسی ماں بھی ملی ہو، جو تربیت اطفال کے فن سے واقف ہو، جس اس کی تربیت کا پورا خیال رکھتی ہو، وقت معینہ پر کھانا دیتی ہو، صاف اور دھلے ہوئے کپڑے پہناتی ہو، اور باپ اس کے معاملات فہم و خرد میں اس کی مدد کرنے پر تیار رہتا ہو، اس میں اعتماد نفس کا جوہر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہو، جو اسے کھیلنے بھی دیتا ہو، اور تربیت سے بھی غافل نہ ہو، کوئی شبہ نہیں، ایسا لڑکا ذہنی اور دماغی

اور جسمی اعتبار سے اس لڑکے سے کہیں زیادہ بلند اور ممتاز ہوگا، جو روکھی سوکھی کھاتا ہے اور جسے صرف ستر پوشی کے برابر لباس میسّر ہے۔ جس کے ماں باپ کو تربیّت اور پرداخت کی فرصت نہیں ملتی، ایسے غریب لڑکے کو فطرت کی طرف سے جو ذکاوت اور ذہانت ملی ہوگی، وہ رائگاں جائے گی۔ اس سی سے وہ قطعاً کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔

خانگی تربیت کی اہمیت

گھر کا اثر انسان پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ بالخصوص معاملاتِ ذیل میں:-

(۱) زبان، لہجہ اور طرز گفتگو گھر ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

بچہ ماں سے زبان سیکھتا ہے۔ اگر ماں کی زبان اچھی ہے تو بچہ کی بھی ہوگی، نوکروں کے میل جول اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں اگر زبان کچھ خراب بھی ہوگی، تو ماں اُسے پھر ٹھیک کر دے گی، رفتہ رفتہ وہ غلط زبان کے استعمال سے اجتناب کرنے لگے گا، زبان، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، تخاطب اور تفہیم کا بہترین ذریعہ ہے، اس کے ذریعے علوم و معارف، ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتے ہیں، تبادلۂ افکار کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا وسیلہ اور ذریعہ نہیں۔

(۲) آداب، معاملات اور احوال میں بھی گھر کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔

اسے بہت بڑا درجہ حاصل ہے، آداب حالیہ گھر ہی میں
بنتے اور پیدا ہوتے ہیں۔ انسان اپنے گھر کا آئینہ
ہے، جو کچھ گھر ہوگا، وہ اس کے چہرے سے
آشکارا ہوگا، آداب نتیجہ ہوتے ہیں، نمونہ اور مثال
کا بچّہ کے سامنے جیسا نمونہ ہوگا۔ جیسی مثال ہوگی، ویسے
ہی اس کے آداب ڈھلیں گے، بچّہ سے اکثر ایسی حرکتیں
سرزد ہوتی ہیں جن کا ادراک اسے نہیں ہوتا، اس کے
مُنہ سے اکثر ایسے الفاظ نکلتے ہیں جن کا مفہوم وہ نہیں
جانتا، اب یہ ماں کا کام ہے کہ اس کے کام میں اور
الفاظ میں معنی اور مفہوم پیدا کرے، اسے صحیح راستے
پر لگا دے، اور غلط الفاظ کے استعمال سے روک دے
انسان کے اخلاق و عمل پر گھر کے بعد جس چیز کا سب
سے زیادہ اثر پڑتا ہے، وہ سوسائٹی ہے۔ اگر یہ اثر
اچّھا ہے تو اس کی روح طاہر ہو جائے۔ لیکن گھر سے
باہر جب دوسروں سے خلا ملا کا موقع ملتا ہے، اور وہ حسن
اخلاق سے محروم ہوتے ہیں، تو وہ پھر گمراہ ہو جاتا ہے،
اور اس کی طاہر روح پھر گندی ہو جاتی ہے۔ باپ
کا فرض ہے کہ وہ بیٹے کو، وہ اپنی اولاد کو دنیا کے
اسرار و رموز سے آشنا کرے، باپ کا فرض ہے کہ وہ

کہ وہ بیٹے کا سچا اور واقعی دوست بن جائے، اپنے تجربات اور مشاہدات سے محروم نہ رکھے۔ تاکہ بچہ، نہ سوسائٹی کا غلط اثر قبول کر سکے نہ گھر کا، بلکہ خود ہی اس میں یہ مادہ پیدا ہو جائے، کہ وہ اپنے اخلاق وکردار کی اچھی تربیت کے بعد نگہداشت اور حفاظت کر سکے، اسی طرح ماں کو بیٹی کی سچی اور مخلص سہیلی بن جانا چاہیئے، وہ بیٹی کے بارے میں جو کچھ چاہتی ہے کہ وہ یہ کرے اور وہ نہ کرے، سب کچھ بتا دے تاکہ کوئی اسے غلط راستے پر نہ ڈال سکے۔

(۳) ذوق فنی اور جمال طبیعی پر بھی گھر اثر کرتا ہے۔ بچہ کی نظر سے اگر وہ اچھے اور شائستہ گھر میں ہو، اچھے مناظر گزرتے ہیں، خوبصورت تصویریں گزرتی ہیں، آنکھوں کو پسند آنے والے مجسمے گزرتے ہیں، انہی چیزوں سے ذوق اور فن سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔

گہرا اثر مختصر الفاظ میں اگر ہم اپنا مفہوم بیان کرنا چاہیں، تو یوں کہیں گے کہ انسان کے اخلاق، عادات، زبان اور ذوق پر سب سے زیادہ اثر گھر کا پڑتا ہے، البتہ اگر اچھا ہو اور سوسائٹی خراب ہو۔ تو گھر کی حاصل کی ہوئی تربیت غارت ہو جاتی ہے۔

اگر یہ دیکھا جائے، کہ گھر میں بچہ کی صحیح اور مکمل تربیت نہیں ہوسکتی، تو ضروری ہے، کہ اس کے لئے اچھی سوسائٹی پیدا کی جائے اس سے گھر کا کام لیا جاسکتا ہے۔ وہ ایسی تربیت پر قادر ہے جو گھر میں ممکن نہیں، اب سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ وہ کون سی سوسائٹی ہے، جو گھر کی قائم مقام بن سکتی ہے؟ ہمارا جواب ہے، مدرسہ!

مدرسہ

اور اس کے فرائض و واجبات

مدرسہ تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا مرکز ہے، اس کا ایک خاص دستور ہے ایک خاص نظام ہے، مدرسہ کا مقصد قیام ہی یہ ہے کہ وہ انسانی سوسائٹی کو درجۂ کمال تک پہنچا دے۔ صحیح تربیت کرے، اور اچھی تعلیم دے، اور سوسائٹی کے افراد کو، سوسائٹی کے لیے نافع اور مفید بنا دے۔ تربیت جس طرح فرد کی ہوتی ہے۔ اسی طرح قوم کی بھی ہوتی ہے۔ روسو کا قول ہے۔ "بچہ کو صرف بچّہ کی مصلحت کا خیال کر کے تعلیم دی جانی چاہیئے"! ہمیں اس قول سے شدید اختلاف ہے، ضروری ہے کہ اس تعلیم میں قوم اور سوسائٹی کا بھی حصّہ ہو، جو آج بچّہ ہے، کل وہ جوان بنے گا، یعنی قوم کا ایک عضو یعنی سوسائٹی کا ایک عنصر۔ پھر اگر یہ عنصر ناتمام ہے یہ عضو ناقص ہے، تو قوم بھی لنڈوری سی رہ جائے گی، اور سوسائٹی بھی پھل

پھول پھل نہیں سکے گی قوم افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہے، لہٰذا قوم کی کامیابی
اس پر منحصر ہے کہ مدرسے اچھے ہوں، اور وہاں تربیت و تعلیم کا معقول انتظام ہو۔

مدرسہ کی حیثیت

مدرس اور طلبہ بدلتے رہتے ہیں، لیکن
ٹھوس اور مستقل چیز ہے، وہیں عقل و
روح، ذہن و دماغ اور جسم و بدن کی تربیت ہوتی ہے، اور یہ تربیت
تازندگی قائم باقی رہتی ہے، مدرسہ کے معنی یہ ہیں کہ بچہ ایک
چھوٹے گھر سے ایک بڑے گھر میں آگیا وہاں کے مقابلے میں یہاں بھائی
بہن زیادہ ہیں، جو اس کے کھیل، عمل، علم، مدرسہ کی زندگی کے
ہر دور میں برابر کے ساتھی ہوتے ہیں جو اس کی مسرت میں حصہ لیتے
ہیں، جلسوں اور مناظروں میں شریک ہوتے ہیں، اس طرح
مدرس کی صورت میں ایک اور شفیق باپ مل جاتا ہے، جو اسے
پڑھاتا ہے، کھلاتا ہے، نصیحت کے موقع پر نصیحت کرتا ہے،
وعظ کے موقع پر وعظ۔ وہ اسے بتاتا ہے مفید کیا ہے، اور مضر کیا؟
کوئی مشکل پیش آتی ہے، تو وہ اسے حل کرتا ہے، کوئی
سوال کیا جاتا ہے، تو وہ جواب دیتا ہے، کوئی غلطی ہوتی ہے
تو وہ اس کی تصحیح کر دیتا ہے، وہ اس کے سامنے ایک نیا
راستہ کھول دیتا ہے، وہ اسے فرض شناسی سکھاتا ہے، وہ
اسے برداشت اور تحمل کا درس دیتا ہے، مدرس کی کئی حیثیتیں
ہوتی ہیں۔ وہ ایک شفیق باپ ہوتا ہے، ایک لائق ساتھی

ہوتا ہے، سچا دوست ہوتا ہے، دور اندیش ہوتا ہے۔ دور اندیش رہنما ہوتا ہے۔

مدرس کا کام یہی نہیں ہوتا کہ وہ پڑھا لکھا دے، سوسائٹی اور قوم کے لئے فرد کو مفید اور کار بنانے کا کام مدرس ہی کرتا ہے۔ قوم کو، اور والدین کو مدرسے سے جو توقعات ہوتی ہیں وہ اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتیں جب تک ہم مدرسہ کو ایسے مدرس نہ مہیّا کریں جنھیں تعلیم سے واقعی دلچسپی ہو، جو تدریس سے ذوق رکھتے ہوں، جو بچوں کی نفسیات سے واقف ہوں، اور فن تربیت کے جدید اصولوں سے آشنا ہوں، مدرس کا بھی صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ تعلیم پر اکتفا کرے۔ اس کا فرض ہے کہ گھر میں جو کسر رہ گئی ہے۔ اُسے پورا کرے، مدرس اگر فرض شناس ہے تو اس کی ڈیوٹی آسان نہیں، بڑی کٹھن ہے۔ اس کا فرض ہے کہ بچہ کے جسم کی نگہداشت کرے، تاکہ وہ مضبوط اور توانا ہو، ہاتھوں کی تربیت کرے، تاکہ وہ کام کر سکیں، اور اچھی طرح کر سکیں۔ عقل اور فکر کی تربیت کرے، تاکہ ان سے صحیح کام لیا جا سکے، قلب اور آنکھ کی تربیت کرے تاکہ وہ نیکی کی طرف راغب ہو، اور جمال قدرت کا مشاہدہ کرے کان کی تربیت کرے، تاکہ وہ اچھی آواز سنیں، یہ کام آسان نہیں ہے، اسے انجام دینے میں بڑی بڑی دشواریوں سے لازمی

طور پر سابقہ پڑے گا، اور ان دشواریوں سے صرف اخلاص اور دیانت اور صداقت کے بل پر عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے، بغیر اس کے یہ منزل سر نہیں کی جا سکتی۔

مدرسہ اور تعاون

مدرسہ کی زندگی کا دار و مدار تمام تر، تعاون و اشتراک عمل ہی پر ہے، اسی طرح وہ ترقی کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔ اور عروج کی سیڑھیاں چڑھ سکتا ہے، مدرسہ کی زندگی کے لئے تعاون اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی کھیت کے لئے پانی۔

مدرسہ ایک جسم ہے اور جسم کی طرح اس کے چند اعضا ہیں اور ہر عضو کا ایک فریضہ ہے۔ مدرسہ کا مہتمم مسئول ہے، جس پر ہر قسم کی جوابدہی ہے، مدرّس عضو حامل ہے، جو اس کے چلانے کا ذمہ دار ہے، باپ بھی ایک ضروری عضو ہے، اور تلامذہ ایسے اعضا ہیں، جو زیر نمو ہیں، مدرّس باپ سے نہیں کہہ سکتا، کہ تم غیر ضروری ہو، باپ مدرّس سے یہ نہیں کہہ سکتا، مدرسہ ایسے اعضا کا مجموعہ ہے کہ اگر ایک عضو کو درد محسوس ہوگا، تو سب ہی تڑپیں گے، مدرسہ اگر ناکام ہے تو خوب معلوم کر لیجیے۔ اس ناکامی کی وجہ عدم تعاون کے سوا کچھ نہیں ہے۔

تعاون ہی مدرسہ کی اصل روح اور زندگی ہے۔ اگر گھر، وزارت تعلیم اور وزارت مال میں مدرسہ کی ترقی، تنظیم، تکمیل وغیرہ

کے سلسلے میں مکمل تعاون اس طرح نہ ہو۔ کہ نشستیں آرام دہ ہوں درجے کشادہ ہوں، کتابیں کافی ہوں تو مدرسہ بھی آگے نہیں بڑھ سکے گا۔

مدرسہ اور اس کے فرائض

بچوں اور لڑکیوں کی تربیت کے سلسلہ میں قوموں اور ملتوں کو سب سے زیادہ بھروسہ اپنے مدرسوں اور مکتبوں پر ہوتا ہے۔ مدرسہ ان گتھیوں کو سلجھاتا، اور ان کوتاہیوں کو پورا کرتا ہے جو گھر اور سوسائٹی کے بس میں نہیں ہوتیں، زبان اگر خراب ہے، اخلاق اگر پست ہے، عادت اگر خراب ہے تو یہ سب مدرسہ ہی کو ٹھیک کرنا ہیں،

مدرسہ فضیلت کا منبع ہوتا ہے۔ اخلاق کریمہ کا مصدر ہوتا ہے طہارۃ اور کمال کا وسیلہ ہوتا ہے اگر کسی مدرسہ میں علم وعمل کا کمال نہیں حاصل ہوتا۔ جسم و عقل کی تکمیل نہیں ہوتی، اخلاق، روح اور وجدان ترتیب نہیں پاتے، تو ہم اس مدرسہ کو کامیاب نہیں کہہ سکتے، اسے فرض شناس نہیں قرار دے سکتے

مدرسہ کا فرض ہے کہ وہ ایسے افراد تیار کرے جو اجتماعی امور میں مفید ہوں، مہذب اور شائستہ ہوں جماعت کے دکھ پر جن کا دل کڑھتا ہو۔ انسانیت عامہ سے جنھیں محبت ہو، اپنی قوم کے فدائی ہوں، مغربی، مشرقی کو، سفید، کالے کو، ہر تعصب سے

دل کڑھتا ہو۔ انسانیت عامہ سے جنھیں محبت ہو، اپنی قوم کے فدائی ہوں، مغربی، مشرقی کو، سفید، کالے کو، ہر تعصب سے آزاد ہوکر اپنا بھائی سمجھتا ہو، اور اسے انسانیت کے دائرہ میں پوری مساوات دیتا ہو۔

قیصر ولیم کی رائے سابق قیصر ولیم نے ۱۸۹۰ء میں معلمین کے ایک بڑے اجتماع کے سامنے تعلیم عالی کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا، "ضروری ہے کہ تعلیم کی بنیاد وطنی ہو۔ ضروری ہے کہ تعلیم کی بنیاد جرمنی ہو، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان یونانی یا لاطینی کی بجائے خالص جرمنی بنیں، ہمارا فرض ہے کہ ہم اس اصول سے دست کش ہو جائیں، جس پر صدیوں عمل ہو رہا ہے اگرچہ لاطینی اور یونانی زبانیں کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھتی ہوں، اور انھیں کیسا ہی مقام کیوں نہ حاصل ہو۔ لیکن اگر یہ زبانیں ہماری قوم کی مصلحت کے مطابق نہیں ہیں، جس کے ہم امین ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ سب کو بھول کر ہم جرمنی زبان ہی کو بنیاد اور اساس تعلیم وتعلّم کی قرار دے لیں، اور جرمنی ادب کو ہر چیز پر مقدم قرار دے لیں۔

اگر سابق قیصر جرمنی کی اس رائے کو ہم تسلیم کر لیں کہ تعلیم کی قومی اور وطنی ہونی چاہیئے، اور یہ کہ ساری توجہ ملکی زبان ہی پر صرف کرنی چاہیئے، تو بھی ہم اس تعصب کی حمایت نہیں

کر سکتے، جو ان الفاظ ہیں، اور قیصر جیسے دوسرے لوگوں کے الفاظ میں جاری ہے۔ نہ ہم اس حربی اور اس جنگی ذہنیت کو سراہ سکتے ہیں جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو غلام بنا لیا جائے، اور ان پر اپنی حکومت قائم کر لی جائے، موجودہ زمانہ میں ان لغویتوں سے قطع نظر کر کے ضروری اور اہم کام یہ ہے کہ ہم مدرسہ کا ایسا نظام مرتب کریں، جو تکمیذ میں روشنی اور چستی پیدا کر دے، اور ہر مناسب غرض کے لئے کام آسکے۔

(۳۲)

مدرسہ

اور زندگی پر اس کا اثر

تربیت حیات، اور تربیت مکتبی میں بہت بڑا فرق ہے تربیت حیات۔ عبارت ہوتی ہے تجارب سے دوسروں کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے، اور اشتراک و تعاون کرنے سے، کام میں اور کھیل میں حصّہ لینے سے، اور تربیت مکتبی وہ چیز ہے، جو مدرسہ کو بچّہ کی نشو ونما میں مساعد بناتی ہے، پہلی صورت میں انسان دوسروں سے حاصل کرتا ہے، اور یہ بے مقصد ہوتی ہے، یعنی انسان دوسرے کے ساتھ رہ کر، جو کچھ حاصل کرتا ہے، اور غیر شعوری طور پر سیکھتا ہے اس میں مقصد کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ تجربے بغیر مدّ مقصد کے حاصل ہو جاتے ہیں، ماہرین اقتصادیات و سیاسیات کے ساتھ جس کی نشست ہوگی، ضرور اس کے تجربے اور معلومات میں اضافہ

ہوگا، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی نشست و برخاست کا مقصد
سیاسی اور اقتصادی معلومات حاصل کرنا تھا، یہ جو کچھ حاصل ہوا،
اس کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن بے مقصد حاصل ہوا۔ اس کے
برعکس اگر آدمی فقط کوئی جماعت (مثلاً مدرسہ) اپنے لئے منتخب کرتا
ہے، یا کسی پارٹی میں شریک ہوتا ہے تو اس جماعت یا پارٹی سے جو
استفادہ ہوتا ہے وہ متعدی ہوتا ہے، اگر جماعت صحیح بنیادوں
پر قائم ہے تو استفادہ بھی صحیح ہوگا، ورنہ بصورت دیگر معاملہ برعکس
ہوگا، لہذا انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس شخص کے ساتھ معاشرت
رکھے، اُسے پہلے سے جانچ اور پرکھ لے، اسی طرح جس جماعت
کو چنے، اس کے بارے میں پہلے سے ضروری معلومات حاصل کرے،
کیونکہ ہر ساتھی ایک دوسرے کی کسی نہ کسی درجہ میں پیروی ضرور کرتا
ہے، لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ یہ بات آدمی کے بس میں ہے کہ
وہ اپنی عقل کو مضبوط بنائے، اور نفس میں استحکام پیدا کرے، تو
یہ بات صاف ہو جاتی ہے، کہ وہ خود اتنی صلاحیت رکھتا ہے کہ
صالح (اچھے) کو اختیار کرے، اور طالح (بُرے) کو ترک کر دے،
لیکن یہ بات بچہ کے لئے نہیں کہی جا سکتی اس لئے کہ نہ اس کا
نفس مستحکم ہوتا ہے، نہ عقل، اس کے عمل اور فعل کا دار و مدار
صرف نقالی پر ہوتا ہے، جو دیکھتا ہے وہ کرتا ہے، جو سنتا ہے
وہ مانتا ہے، وہ نفع نقصان کو نہیں دیکھتا، مستقبل پر اس کی

نظر نہیں ہوتی

انسان اور تجربہ

لیکن کیا انسان کے لیے وہ تجارب کافی ہیں جو وہ دوسروں کے ساتھ رہ کر حاصل کرتا ہے؟ کوئی شبہ نہیں یہ تجارب بڑے قیمتی اور اہم ہوتے ہیں۔ لیکن تکمیل حیات کے لئے یہ کافی نہیں، ضروری اور بہت ضروری ہے کہ تربیت مکتبی بھی حاصل کی جائے، یہی تربیت بچّہ کے حواس، ادراک اور قوئ کی صحیح اور مکمل تربیت کرتی ہے، اسی تربیت پر، میلان و عادات، اخلاق و تہذیب، علم و روح اور عقل و بدن کی تکمیل منحصر ہے، ایک بچّہ ہمیشہ اس کا محتاج رہتا ہے، کہ کوئی اس کے سامنے ہو، جسے وہ دیکھے، جس کی وہ پیروی کرے، جسے وہ مانے، اپنے افعال، اقوال اور حرکات میں ہو بہو اس کی پیروی کرے، اس طرح رفتہ رفتہ وہ غلطی میں تمیز کرنے لگتا ہے، اور اس سے مجتنب رہنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہوجاتی ہے۔ تربیت جدید کا اصل نقطۂ نظر یہی ہے۔

نئے زمانے کے مدرّس کا یہ کام ہے کہ وہ مصلحت، ملائمت اور مناسبت کو پیش نظر رکھ کر اپنا کام کرے۔ وہ موجودہ زندگی کو بھی دیکھے، اور آنے والی زندگی کا بھی خیال رکھے، وہ ایسے راستے پر ڈالے، جو انسانیت، وطن اور قوم کے لیے مستقبل میں کارآمد ہو، اس طرح مدرس کسی ایک بچّہ کی نہیں، پوری انسانیت کی وطن

کی ، ساری قوم کی خدمت کرتا ہے ۔

وحشی قومیں

وحشی قومیں تعلیم کی طرف توجہ نہیں کرتیں ۔ نہ مدراس کے قیام کی ضرورت محسوس کرتی ہیں، اس کے برعکس متمدن اقوام تعلیم پر پوری توجہ کرتی ہیں ، مدارس کا قیام ان کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے ، وہ بے دریغ اس کام پر روپیہ خرچ کرتی ہیں ۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ جس انسانی زندگی کے لیے پانی اور ہوا ضروری ہے بالکل اسی طرح قوموں اور ملتوں کی زندگی کے لیے مدرسوں کا قیام ضروری ہے علم زندگی ہے اور جہل کی زندگی موت سے بدتر ۔

وحشی قومیں اپنی زندگی میں ان معلومات اولیہ پر بھروسہ کرتی ہیں جو باپ دادا سے وراثتہً منقول ہوتے چلے آئے ہیں ، لیکن یہ زندگی کے لیے کافی نہیں ہیں ، اور اگر آپ کو ہمارے اس خیال کی صداقت میں شبہ ہے تو ایک نظر کسی جاہل پر اور ایک نظر کسی عالم پر ڈال کر دیکھ لیجئے ، خود ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا آپ کو اندازہ ہوگا ، ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے ۔ پہلے کا شمار انسانوں میں ہوتا ہے اور دوسرے کا حیوانوں میں ۔ وحشی قوم کا ایک بچہ کوئی مدرسہ نہیں پاتا ، جہاں وہ تعلیم و تربیت حاصل کرے ، وہ صرف اپنی زندگی میں اس علم پر بھروسہ کرتا ہے ، جو اس نے اپنے سماج سے حاصل کیا ہے وہ اسے

نظر نہیں ہوتی

انسان اور تجربہ

لیکن کیا انسان کے لیے وہ تجارب کافی ہیں جو وہ دوسروں کے ساتھ رہ کر حاصل کرتا ہے؟ کوئی شبہ نہیں یہ تجارب بڑے قیمتی اور اہم ہوتے ہیں۔ لیکن تکمیل حیات کے لئے یہ کافی نہیں، ضروری اور بہت ضروری ہے کہ تربیت مکتبی بھی حاصل کی جائے، یہی تربیت بچّہ کے حواس، ادراک اور قویٰ کی صحیح اور مکمل تربیت کرتی ہے، اسی تربیت پر، میلان و عادات، اخلاق و تہذیب، علم و روح اور عقل و بدن کی تکمیل منحصر ہے، ایک بچّہ ہمیشہ اس کا محتاج رہتا ہے، کہ کوئی اس کے سامنے ہو، جسے وہ دیکھے، جس کی وہ پیروی کرے، جسے وہ مانے، اپنے افعال، اقوال اور حرکات میں ہو بہو اس کی پیروی کرے، اس طرح رفتہ رفتہ وہ غلطی میں تمیز کرنے لگتا ہے، اور اس سے مجتنب رہنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ تربیت جدید کا اصل نقطۂ نظر یہی ہے۔

نئے زمانے کے مدرس کا یہ کام ہے کہ وہ مصلحت، ملائمت اور مناسبت کو پیش نظر رکھ کر اپنا کام کرے۔ وہ موجودہ زندگی کو بھی دیکھے، اور آنے والی زندگی کا بھی خیال رکھے، وہ ایسے راستے پر ڈالے، جو انسانیت، وطن اور قوم کے لیے مستقبل میں کارآمد ہو، اس طرح مدرس کسی ایک بچّہ کی نہیں، پوری انسانیت کی وطن

کی ، ساری قوم کی خدمت کرتا ہے ۔

وحشی قومیں

وحشی قومیں تعلیم کی طرف توجہ نہیں کرتیں ۔ نہ مدراس کے قیام کی ضرورت محسوس کرتی ہیں،
اس کے برعکس متمدن اقوام تعلیم پر پوری توجہ کرتی ہیں ،
مدارس کا قیام ان کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے ، وہ بے دریغ
اس کام پر روپیہ خرچ کرتی ہیں ۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ جس
انسانی زندگی کے لیے پانی اور ہوا ضروری ہے بالکل اسی طرح
قوموں اور ملتوں کی زندگی کے لیے مدرسوں کا قیام ضروری ہے
علم زندگی ہے اور جہل کی زندگی موت سے بدتر ۔

وحشی قومیں اپنی زندگی ہیں ان معلومات اوّلیہ پر بھروسہ کرتی
ہیں جو باپ دادا سے وراثتہً منقول ہوتے چلے آئے ہیں ، لیکن
یہ زندگی کے لیے کافی نہیں ہیں ، اور اگر آپ کو ہمارے اس خیال
کی صداقت میں شبہ ہے تو ایک نظر کسی جاہل پر اور ایک نظر
کسی عالم پر ڈال کر دیکھ لیجئے ، خود ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا
آپ کو اندازہ ہو گا ، ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے ۔
پہلے کا شمار انسانوں میں ہوتا ہے اور دوسرے کا حیوانوں میں ،
وحشی قوم کا ایک بچہ کوئی مدرسہ نہیں پاتا ، جہاں وہ تعلیم و
تربیت حاصل کرے ، وہ صرف اپنی زندگی میں اس علم پر بھروسہ
کرتا ہے ، جو اس نے اپنے سماج سے حاصل کیا ہے وہ اپنے

بڑوں کی ہر معاملہ میں پیروی کرتا ہے اور ایسی زندگی بسر کرتا ہے، جو انسانیت کے معیار پر پوری نہیں اُترتی۔

عمل اور ایجاد کے لیے، نقالی بیکار ہے اس کے لئے، تعلیم، مشق اور جدوجہد ضروری ہے، اور یہ کام بغیر مدرسہ کے نہیں انجام پا سکتا، اور مدرسہ بغیر ایسے لوگوں کے کامیاب نہیں ہو سکتا، جو علم وعمل کے ماہر ہوں۔ تاکہ وہ اپنے شاگردوں کو عمل کا صحیح راستہ دکھا سکیں۔

سوسائٹی کی طلب سوسائٹی جن چیزوں کی جویا ہے ان کی تعلیم بغیر مدرسہ کے نہیں ہو سکتی، وہاں ایسی چیزوں کی تعلیم بآسانی ممکن ہے، جن کی تعلیم خارج میں نہیں مل سکتی۔ ہم مانتے ہیں صناعات اولیہ اور علم ابجدی کا درس مدرسہ کے باہر بھی لیا جا سکتا ہے، لیکن ترقی یافتہ صنعتیں اور وہ علوم جو درایت اور تجربہ، بحث ومناظرہ، کتب اور حوالہ جات کے بغیر نہیں آسکتے، ظاہر ہے، ان کی تعلیم صرف مدرسہ ہی میں ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ مدرسہ بہترین تعلیم گاہ ہے مدرسہ میں شاگرد کو پڑھنے کا وقت بھی ملتا ہے، سیکھنے کا بھی، مشق اور تجربہ کا بھی، نظریات وخیالات کو پرکھنے کا بھی، یہ چیزیں بغیر مدرسہ کے کسی طرح بھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔

تربیت جدیدہ کا مطالبہ مدرس اور مدرسہ سے یہ ہے۔ کہ

تربیت سطحی نہ ہو، عملی ہو، یوں سمجھنا چاہیئے۔ مدرسہ عالم اکبر کے مقابلہ میں ایک عالم اصغر ہے۔ یہاں زندگی اور دنیا کی ہر چیز ممثل ہو کر نظر آتی ہے۔ اگر اس اسلوب میں تربیت نہ ہوئی۔ تو بچہ جب باہر نکلے گا تو وہ اپنے تئیں ایک ایسی دنیا میں پائے گا۔ جو اس کے لئے بالکل نئی ہوگی، اور اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اب وہ کیا کرے؟ کس طرح زندگی بسر کرے؟

خلاصہ کلام

خلاصۂ کلام یہ کہ زندگی عمل کی محتاج ہے،! وہی اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اگر حیاتِ انسانی کے لیے غذا ضروری ہے تو تربیت بھی ایسا ضروری ہے۔ تربیت حیات ذاتی اور حیاتِ اجتماعی دونوں کے لئے یکساں ضروری اور لابدی ہے، اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ مدرسہ بڑی دنیا کے مقابلہ میں ایک چھوٹی دنیا ہوتا ہے۔

(۲۳)

مدرسہ ایک سوسائٹی

مدرسہ، اپنی ذات کے اعتبار سے بجائے خود، ایک چھوٹی موٹی سوسائٹی ہے۔ اس سے بہتر ذریعہ اور وسیلہ، تلامذہ کی تربیت اجتماعی کا کوئی دوسرا نہیں مہیا ہو سکتا، مدرسہ ہی کی زندگی وہ سچی زندگی ہے جو گھر اور سوسائٹی کو ایک بنا دیتی ہے، اور افراد کو سوسائٹی کا مفید عنصر بنا دیتی ہے۔ خواہ طبقات اور ماحول کا کتنا اور کیسا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔

مکتبی سوسائٹی

مکتبی سوسائٹی میں تلمیذ جان لیتا ہے کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرے؟ غیروں کے ساتھ کیونکر تعاون کرے؟ دوسرے کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، پڑوسی کے حقوق کیوں کر ادا کرے؟ اپنے معاملات میں، امانت و دیانت کے اصول کی

پیروی کس طرح کرے؛ قول کا سچا بن جائے، فیصلہ کرے تو عدل کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، اجنبیوں پر شفقت کرے اپنے عمل میں مخلص ہو، ذمہ داری کا احساس رکھتا ہو اور ضمیر کی رہنمائی قبول کرتا ہو۔

مدرسہ کی زندگی

مدرسہ کی زندگی ہر روز طلبہ کو ایسے وسائل مہیا کرتی ہے۔ کہ وہ فضائل اجتماعیہ سے بہرہ مند ہوں، اوران خصائص کا حسنِ اخلاق و معاملات پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اپنے عادات و خصائل کے اعتبار سے طلبہ ہمیشہ اس کے محتاج رہتے ہیں، کہ ان کی قرار واقعی نگہداشت اور نگرانی کی جائے، انھیں وعظ و پند سے محروم نہ رکھا جائے، تاکہ مکلتبی سوسائٹی کے وہ اچھے رکن بن سکیں، اور صحیح بنیادوں پر ترقی کر سکیں۔ مدرسہ میں اس کی پوری نگرانی کی جانی چاہیئے۔ کہ تلمیذ جھوٹ کا عادی نہ ہو، معاملات میں غلط کار نہ ہو، بدتمیز نہ ہو، اس میں پستی اور دنارت کی عادتیں نہ ہوں، مدرسہ میں تمام طلبہ کے ساتھ یکساں برتاؤ ہونا چاہیئے، چاہے ان میں کوئی فقیر ہو یا امیر، بدصورت ہو یا خوب رو، اونچے گھرانے کا ہو یا نیچے گھرانے کا، مدرسہ کا فرض ہے، کہ وہ اپنے طلبہ کو جلن اور حسد کا مادہ نہ پیدا ہونے دے، اوران کے حقوق کا پورا پورا لحاظ اور خیال رکھے، ان کی شخصی عادتوں کو سنوارنے میں اجتماعی مصلحتوں کا بھی پورا خیال

رکھے۔ جب انھیں تعاون کی ضرورت محسوس ہو ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کرے۔ اس طرح مدرسہ اچھی سوسائٹی بن سکتا ہے، جس میں قومیت اور وطنیت کی روح ابھر سکتی ہے اور اخلاق مکمل ہو سکتے ہیں، اخوت اور مساوات کی روح بیدار ہو سکتی ہے۔ علم و عمل کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اطلاع اور بحث سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ نظام اور کمال سے لگاؤ پیدا ہو سکتا ہے"

(۲۴)

مدرسہ کی حیات اجتماعی

روشن — اور — خوش گوار زندگی!

مکتبی زندگی بڑی نفع بخش ہوتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مکتبی سوسائٹی سے بڑھ کر روح اجتماعی پیدا کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں، یہاں مدرس طلبہ کو اس سوسائٹی کے لئے تیار کرتا ہے جو اس کی منتظر ہے، وہ انھیں سوسائٹی سے اس طرح قریب کر دیتا ہے کہ وہ اس کے لیے اجنبی نہیں رہتے۔

اچھا مدرّس اچھا مدرس صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا کہ پڑھا دے وہ قدم قدم پر اس کا لحاظ رکھتا ہے، کہ درس حوادث حیات اور حیات ذاتی سے قریب ہو، تاکہ آگے چل کر بھی بچے تنومند اور سلیم العقل نوجوان بن سکیں۔ اپنی روزی آپ کما سکیں، اور کامیاب زندگی بسر کر سکیں، یہ جان سکیں کہ وطن ان

سے کیا چاہتا ہے؟ جس سوسائٹی میں رہتے ہیں اس کے احتیاجات سے واقف ہوں۔

موجودہ زمانہ میں ہم مدرسے سے یہ اُمید رکھتے ہیں کہ وہ ایک منظم ادارہ ہو، جہاں تلامیذ ایک نظام کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوں۔ تعلیم کا بھی ایک دستور ہو، اور عمل کا بھی، کھیل اور پڑھائی کے درمیان مناسب تقسیم اوقات ہو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی طلبہ کی نظر ہو۔ مثلاً کمرہ خالی ہے۔ اس وقت کوئی تلمیذ موجود نہیں، تو وہ سوئچ آف کر دے، اور خواہ مخواہ بلب کو جلتا چھوڑ کر بجلی اور روپیہ ضائع نہ کرے، گھر پر وہ یہی کرتا ہے۔ لیکن مدرسہ میں آکر اس کا چنداں خیال نہیں کرتا۔

گھر کی کوتاہی

مدرسہ ان کوتاہیوں کو بھی پورا کرتا ہے جو گھر میں رہ جاتی ہیں، بالخصوص ان بچوں پر اسے خاص توجہ کرنی پڑتی ہے۔ جو غریب گھرانوں کے ہوتے ہیں، اور صحیح وسائل تربیت سے محروم رہ جاتے ہیں، مدرسہ میں بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ وہ مدرسہ کو اچھا مدرسہ بنانے میں کس طرح جدوجہد کریں، اس کے باغیچوں کو کس طرح ٹھیک کریں اس کی روشوں کو کس طرح درست کریں؟ ڈرامے کس طرح سیکھیں؟ کھیل کا میدان کیسے ٹھیک کریں؟ جلسوں کا انتظام کیونکر کریں؟ دستر خوان کس طرح بچھے؟ مہمانوں کا استقبال کس طور سے کیا جائے؟ انہی سب باتوں

اجتماعی روح پیدا ہوتی اور تربیت پاتی ہے۔

وطنیت، مطالعہ، املا، انشا وغیرہ کے اسباق میں اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے، کہ موضوعات، وقت کے حوادث سے متعلق اس طرح مدرسہ اپنے تلامذہ کے اندر صحیح وطنی اور اقتصادی اسپرٹ پیدا کر سکتا ہے۔ سال کے دوران میں متعدد مواقع ایسے آتے ہیں جب ہم اپنے تلامذہ کے اندر صحیح جذبہ اور روح اُبھار سکتے ہیں۔ مثلاً یوم میلاد النبی یوم آزادی، عید الفطر، عید الاضحیٰ، مجالس آئین ساز کے انتخابات، وزیر اعظم یا صدر حکومت کی افتتاحی تقریریں، یہ اور اس طرح کے دوسرے مواقع، قومی زندگی کو استوار کرنے، اور وطنیت کی روح بیدار کرنے میں بہت کام دے سکتے ہیں۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن میں طلبہ بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ پوری رغبت اور اشتیاق کے ساتھ!

مدرسہ کی حیات اجتماعی کو کامیاب اور سودمند بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف قسم کے کھیلوں کا بندوبست کیا جائے دلچسپی اور تفریح کے زیادہ سے زیادہ انتظامات کئے جائیں، تاکہ ان میں زیادہ سے زیادہ نشاط اور چستی پیدا ہو، اور وہ اپنی زندگی کو زیادہ طور پر مرتب اور منظم کر سکیں۔

مدرسہ کی کامیابی

مدرسہ کی کامیابی کے لیے جس طرح جس طرح مختلف قسم کے کھیلوں کا

انتظام ضروری ہے، اسی طرح مختلف قسم کی جماعتوں کا قیام بھی ضروری ہے۔ بوئے اسکاوٹ کا انتظام بھی ہونا چاہیئے، ادبی، علمی انجمنیں بھی ہونی چاہئیں۔ رفاہ عام کی جماعتیں بھی ترتیب پانی چاہئیں، معلموں کو ان جماعتوں کی تشکیل و قیام میں بڑھ چڑھ کر حصّہ نہیں لینا چاہیئے، یہ کام طلبہ پر ہی چھوڑ دینا چاہیئے، کہ وہ ان کی ضرورت محسوس کریں، اور انھیں تشکیل پذیر کریں۔ مدرس صرف وقت ضرورتِ صلاح و مشورہ دے سکتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ باقی سارا کام اس سلسلہ میں طلبہ ہی کو کرنا چاہیئے، انھیں خود اپنے اوپر اتنا اعتماد ہونا چاہیئے، کہ وہ مکتبی اجتماعات کا انتظام کر سکیں۔ موسیقی کی محفلیں ترتیب دیں، تھیٹر کا اسٹیج تیار کریں، علمی و ادبی لیکچروں کا انتظام کریں۔ اکسکرلیشن کا بندوبست کریں۔ اسی طرح ان میں قیادت و رہنمائی کی صلاحیت پیدا ہوتی اور ترقی کرتی ہے۔ اعتماد نفس اور خدمت قومی و اجتماعی کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، اصلاح اجتماعی پر غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے، اور ہر طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک منظم جماعت کا سرگرم عضو ہے، اس جماعت دیا دمدرسہ) کی کامیابی خود اس کی کامیابی ہے، اور اس کی ناکامی خود اس کی ناکامی ہے۔ اس کی سربلندی کے لیئے وہ کوشش کرتا ہے۔ اس سے انتساب پر فخر کرتا ہے۔ اس کے حقوق اور اپنے فرائض پہچانتا ہے۔ اس

ہیں ایسی اجتماعی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے جو زندگی بھر ساتھ دیتی ہے، اور وہ ہمیشہ مدرسہ کی محبت اپنے دل میں موجود پاتا ہے،

لیکن یاد رکھنا چاہیئے، مدرسہ کی زندگی کے لئے جتنی مذکورہ سرگرمیاں ضروری ہیں، اتنی ہی تعلیم بھی ضروری ہے، ترازو کے دونوں پلڑے بالکل یکساں ہوں۔



(۲۵)

گھر، مدرسہ اور کھیل کا میدان

یورپ میں طلبہ کی اخلاقی، عقلی، اجتماعی اور جسمی تربیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اگر ہم آج کے بچوں پر، اور چالیس برس پہلے کے بچوں پر ایک نظر ڈالیں تو بہت بڑا فرق، آج اور کل کے چہروں میں نظر آئے گا۔ انگلستان کے بچے، مجموعی حیثیت سے اس لئے زیادہ تنومند اور شگفتہ ہوتے ہیں کہ شروع ہی سے ان کی کافی کافی غور و پرداخت کی جاتی ہے۔ وہاں بچہ کی صرف خانگی تربیت ہی کافی نہیں سمجھی جاتی، بلکہ مکتبی تربیت کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے، اور کھیل کے میدان کی تربیت بھی بہت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اور قبل اس کے کہ وہ دنیا کے میدان میں قدم رکھے وہ بہت کچھ سیکھ چکتا ہے، اور معلوم کر چکتا ہے وہاں کا بچہ جب پانچ برس

کا ہو جاتا ہے، تو وہ مدرسہ ابتدائیہ میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ فرصت کے اوقات میں ماں باپ، بچہ کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ضروری مدد کرتے ہیں۔ اچھی اچھی کہانیاں سناتے ہیں، اور سونے سے پہلے پہلے وہ کہانی کہانی میں اسے بہت سی ضروری باتیں بتا دیتے ہیں اسے ایسے کھیلوں میں معروف رکھا جاتا ہے جنھیں ہم تعلیمی کھیل کہہ سکتے ہیں، ان کھیلوں سے وہ اعداد جوڑنے لگتا ہے، اور حروف ابجدی کی شناخت میں اسے آسانی ہوتی ہے اشکال ہندسی بھی اس کی سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔ مثلث، مربع مستطیل دائرہ، نصف دائرہ — یہ سب چیزیں وہ کھیل ہی کھیل میں جان لیتا ہے۔

بچہ اور کھیل

بچہ کو وہاں ایسے کھیل بھی کھلائے جاتے ہیں۔ کہ ان میں تکوینی ذوق پیدا ہو جاتا ہے، اس کو چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز اور سائیکلیں دی جاتی ہیں۔ انھیں توڑنے پھوڑنے اور ان سے کھیلنے میں اسے پرزوں کی ساخت کی پہچان آجاتی ہے، اور وہ انھیں جوڑنے بھی لگتا ہے۔ ان بچوں کو کوئی ایسا کھیل نہیں کھلایا جاتا، جو ان کے تکوینی یا عملی و علمی ذوق کو اس طرح وہ انجن اور ڈبوں کے متعلق بہت کچھ جان جاتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ انگلستان کی فضا بھی علمی ہے، اور وہاں کا گھر بھی!

(۲۶)

بچّہ کی تربیت میں

گھر — اور — مدرسہ کا — حصّہ

تربیت جدیدہ کا ایک اصول یہ ہے کہ اس میں گھر اور مدرسہ کا بچّہ کی تربیت میں برابر حصّہ ہوتا ہے۔ بچپن کی تربیت صحیحہ بڑی عمر میں اپنے جوہر دکھاتی ہے، اکثر گھروں میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا کو زندگی سے کوئی مس نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کا مقصد نہیں مانتے، وہ صرف اپنے دوست ہوتے ہیں، وہ لے لیتے ہیں دیتے نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکتبی تربیت کتنی اہم اور ضروری ہے اور وہ گھر کے نقائص کو کس طرح سدھار سکتی ہے، مدرسہ کی تربیت دیتی بھی ہے اور لیتی بھی ہے۔ وہ زندگی کے مفہوم سے آشنا ہوتی ہے، وہ زندگی کا مقصد جانتی ہے گھر اگر اس کا مددگار ہو، تو وہ بچّہ کی علمی، عملی، ذہنی، ہر قسم کی صلاحیت

بڑی خوبی سے پیدا کر دیتی ہے۔

وسائلِ اشتراک وہ وسائل جو گھر اور مدرسہ کے اشتراک و تعاون سے بروئے کار لائے جا سکتے ہیں، یہ ہیں:-

(۱) دورِ طفولیت میں بچہ کے اطوار و سکنات کی پوری نگہداشت اصل بنیاد یہی ہے اور اسی پر بچہ کے مستقبل اور زندگی کا انحصار ہے۔ انگلستان میں دَورِ طفولیّت کی تربیت کو اتنا اہم سمجھا جاتا ہے کہ قبل اس کے کہ بچّہ پیدا ہو، وہ اس کی پندرہ برس کی عمر تک کا پروگرام بنا کر اسے سوچنے لگتے ہیں۔ وہاں کا ترقی یافتہ طبقہ جو وراثت کے اثر کا قائل ہے۔ وہ اور زیادہ احتیاط اور چھان بین سے کام لیتا ہے وہ ہرگز کسی ایسے طبقہ میں شادی نہیں کرے گا۔ جہاں عقلی یا عصبی امراض پائے جاتے ہوں، ان سے اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بچہ میں بھی پیدا ہو جائیں گی۔ وہ آگے چل کر کہیں پاگل نہ ہو جائے، کہیں سِل یا دق کا شکار نہ بن جائے۔

(۲) وہاں بچّہ کو نشو و نما کے سلسلہ میں پوری آزادی دی جاتی ہے۔ اسے ذرا نہیں چھیڑا جاتا۔ اور اس طرح اس میں اجتماعی حس پیدا کی جاتی ہے ہمارا یہ مقصد ہرگز

نہیں کہ بچّہ جو کچھ کرے اسے بے چون و چرا کرنے
دیا جائے۔ لیکن اسے خود سے کام کرنے، اور خود سے
تجربہ کرنے کا موقع ضرور دیا جانا چاہیئے۔ ہم دور
سے اس کی نگہداشت کرتے رہیں، یہی ہمارا کام ہے
ہمیں چاہیئے کہ اسے اصلاح کا خود موقع دیں۔ اور
جب واقعی وہ ہمارا کام ہے ہمیں چاہیئے کہ اسے
اصلاح کا خود موقع دیں۔ اور جب واقعی وہ ہماری
مدد کا محتاج ہو تب اس کی مدد کریں، ہمیں کوشش
کرنی چاہیئے کہ اس میں معرفتِ نفس پیدا ہو۔ اپنے
شعور وعواطف کو وہ ضبط ونظم کا خوگر بنا سکے۔

(۳) بچّہ کو ورزشی کھیلوں کا بھی پورا موقع ملنا چاہیئے۔ اس
سے بہتر کوئی ذریعہ بھی اخلاق و جسم کو سدھارنے کا نہیں
ہے۔ ان کھیلوں سے اس میں عمل کا جذبہ تیز ہوتا ہے۔
وہ صرف اپنے ہی لیے نہیں سوچتا۔ پوری ٹیم کے لیے
سوچتا ہے۔

(۴) یہ بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونا چاہیئے، کہ کبھی کبھی
بچّہ خاموشی اور سکوت کو ترجیح دیتا ہے۔ اس میں مخل
ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔

(۵) مراہقت اور بلوغ کا زمانہ بڑا خطرناک ہوتا ہے اس دور

ہیں خاص طور پر کڑی نگرانی اور مکمل نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۶) وہ کام جو ہاتھ سے کیے جاتے ہیں، ضروری ہے کہ بچہ کو انھیں کرنے دیا جائے۔ اسی طرح ذہنی عناصر کو تقویت دینے والے فنون سے بھی اسے رغبت دلائی جائے، تاکہ اس کا جسمی و عقلی نمو ساتھ ساتھ ہو۔

(۷) بچہ کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لئے ہر مرحلہ پر گھر اور مدرسہ میں مکمل تعاون ہونا چاہیے۔ بغیر اس کے، اس کی پرورش اور پرداخت مکمل نہیں ہو سکتی اور نہ تربیت کا صحیح مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

متمدن اقوام متمدن اقوام ہیں، اور خاص طور پر انگلستان اور امریکہ میں گھر اور مدرسہ کے درمیان کامل طور پر باہمی اعتماد پایا جاتا ہے، ان دونوں میں بڑا گھر اُس کا مدرسہ ہوتا ہے، ان دونوں کے پیشِ نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ بچہ کا اٹھان اچھا ہو۔ ایسا نہیں ہوتا کہ مدرسہ ایک سرے پر ہو، اور گھر دوسرے پر۔ اور یہ دونوں مل نہ سکیں؛ مجھے یہ کہتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے۔ کہ ہمارے ہاں گھر اپنا فرض بالکل ادا نہیں کرتا۔ صرف مدرسہ ہی کا سارا کام کرنا پڑتا ہے اپنا بھی اور گھر کا بھی۔

نہیں کہ بچّہ جو کچھ کرے اسے بے چون و چرا کرنے دیا جائے۔ لیکن اسے خود سے کام کرنے، اور خود سے تجربہ کرنے کا موقع ضرور دیا جانا چاہیئے۔ ہم دور سے اس کی نگہداشت کرتے رہیں، یہی ہمارا کام ہے ہمیں چاہیئے کہ اسے اصلاح کا خود موقع دیں۔ اور جب واقعی وہ ہمارا کام ہے ہمیں چاہیئے کہ اسے اصلاح کا خود موقع دیں۔ اور جب واقعی وہ ہماری مدد کا محتاج ہو تب اس کی مدد کریں، ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اس میں معرفتِ نفس پیدا ہو۔ اپنے شعور و عواطف کو وہ ضبط و نظم کا خوگر بنا سکے۔

(۳) بچّہ کو ورزشی کھیلوں کا بھی پورا موقع ملنا چاہیئے۔ اس سے بہتر کوئی ذریعہ بھی اخلاق و جسم کو سدھارنے کا نہیں ہے۔ ان کھیلوں سے اس میں عمل کا جذبہ تیز ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے ہی لیے نہیں سوچتا۔ پوری ٹیم کے لئے سوچتا ہے۔

(۴) یہ بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونا چاہیئے، کہ کبھی کبھی بچّہ خاموشی اور سکوت کو ترجیح دیتا ہے۔ اس میں مخل ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔

(۵) مراہقت اور بلوغ کا زمانہ بڑا خطرناک ہوتا ہے اس دور

ہیں خاص طور پر کڑی نگرانی اور مکمل نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۶) وہ کام جو ہاتھ سے کیے جاتے ہیں، ضروری ہے کہ بچہ کو انھیں کرنے دیا جائے۔ اسی طرح ذہنی عناصر کو تقویت دینے والے فنون سے بھی اسے رغبت دلائی جائے، تاکہ اس کا جسمی و عقلی نمو ساتھ ساتھ ہو۔

(۷) بچہ کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لئے ہر مرحلہ پر گھر اور مدرسہ میں مکمل تعاون ہونا چاہیئے۔ بغیر اس کے، اس کی پرورش اور پرداخت مکمل نہیں ہوسکتی اور نہ تربیت کا صحیح مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

متمدن اقوام متمدن اقوام میں، اور خاص طور پر انگلستان اور امریکہ میں گھر اور مدرسہ کے درمیان کامل طور پر باہمی اعتماد پایا جاتا ہے، ان دونوں میں بڑا گھر اُس کا مدرسہ ہوتا ہے، ان دونوں کے پیشِ نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ بچہ کا اٹھان اچھا ہو۔ ایسا نہیں ہوتا کہ مدرسہ ایک سرے پر ہو، اور گھر دوسرے پر ہو اور یہ دونوں مل نہ سکیں، مجھے یہ کہتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے۔ کہ ہمارے ہاں گھر اپنا فرض بالکل ادا نہیں کرتا۔ صرف مدرسہ ہی کا سارا کام کرنا پڑتا ہے اپنا بھی اور گھر کا بھی۔

اس صورت سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ بچّوں کے آبا کو کبھی کبھی مدرسہ میں بُلایا جائے، اور بچہ کی تعلیم و تربیت سے متعلق، ان کے سامنے سارے حالات رکھے جائیں۔ انھیں صحیح صورت باخبر کیا جائے اور انھیں بتایا جائے کہ مدرسہ کس طرح ان کی تعلیم و تربیت کے مسئلہ میں دلچسپی لے کر انھیں بلند اور اعلی بنانا چاہتا ہے۔

نیویارک میں مدرسہ، گھر کو اپنے سے قریب رکھنے کی بہت کوشش کرتا ہے، امریکہ میں آبا مدرسہ کے سب سے سرگرم عامل ہیں، وہ ان لیکچروں میں جو عام ہوتے ہیں۔ جوش و شوق سے شرکت کرتے ہیں۔ جو ڈیبیٹ ہوتے ہیں ان میں بھی حصّہ لیتے ہیں، غرض مدرسہ کی اجتماعی سرگرمیوں میں جس حد تک بھی انھیں موقع ملتا ہے۔ وہ پوری شرکت کرتے ہیں، ان کا اور مدرسہ کا نسل تعلق ہے، جو ایک خاندان اور اس کے افراد میں ہوتا ہے۔

امریکہ کے مدرسے امریکہ میں آبا کی اور تعلیم گاہوں کی متعدد سوسائٹیاں قائم ہیں۔ جن میں پورا پورا اشتراک اور ربط ہے، ان کے جلسے ہوتے رہتے ہیں، اور اہم موضوعات — مثلاً، مدرسہ کے کام — مدرسہ کا مقصد — بچہ اور اس کی نفسیات — بچہ اور اس کی تربیت — پر لیکچرز دئے جاتے ہیں۔ ان میں ہر دو سوسائٹیوں کے

لوگ شریک ہوتے ہیں، اور سچے دل سے حصّہ لیتے ہیں۔
ان میں سے ہر ایک کا مقصد، بچّے کی صحیح تربیت اور اس کی
تکمیل ہے۔ انھیں یقین ہے کہ آج کا بچہ، کل پورا مرد بنے گا۔
اور آج کی تربیت، پورے طور پر کل ظاہر ہوگی، آج جو بیج
ڈالے جائیں گے، کل وہ فصل لائیں گے، اگر آج ہم بچوں کی
تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھیں اور صحیح انتظام کرتے
ہیں، گھر میں مدرسہ میں، اور کھیل کے میدان میں انھیں
اپنی ذہنی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے، تو مستقبل
کے لئے ہم ایک اچھی عقل اور اپنی قوم تیار کر
رہے ہیں۔

یورپ کی ایک مثال

ونٹکا (WINETKA) امریکہ میں بچوں کے جو مدرسے
ہیں، ان میں مثال کے داخلہ کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی
ہے کہ آیا مدرسہ سے پورا پورا تعاون کریں گے، اگر کوئی باپ
اس شرط کو نہ قبول کرے، تو مدرسہ میں بچہ کو نہیں
داخل کیا جاتا ہے

انگلستان میں بھی گھر، اور مدرسہ کے درمیان رابطہ
قائم کرنے کی بڑی سرگرم کوششیں ایک عرصۂ دراز سے جاری
ہیں۔ اور ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک تعلیم و تربیت کے

معاملہ میں، مدرسہ کی ہدایت پر صدق دل سے عمل کرتے ہیں،
تعلیم گاہوں کی طرف سے موسیقی کے اجتماعات، تھیٹر اور ورزشی
کھیلوں کی تقریبات میں آبا کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا ہے
تاکہ وہ دیکھیں ان کے بیٹوں نے موسیقی میں اداکاری میں،
ورزش میں کتنی ترقی کی ہے؟ اور انھیں ان لوگوں سے ملایا جاتا
ہے۔ جو مدرسہ کے اہم امور کے انچارج ہوتے ہیں۔

انگلستان میں گھر ایک چھوٹا سا مدرسہ ہوتا ہے، وہاں اُسے
علمی سوسائٹی اور علمی فضا حاصل ہوتی ہے، وہاں اُسے علمی
سوسائٹی اور علمی فضا حاصل ہوتی ہے۔ ماں تعلیم دیتی ہے، باپ
رہنمائی کرتا ہے، نوکر پڑھ کر سناتا ہے۔ گھر کا ہر فرد صبح سے
لے کر شام تک بچّہ کی فکر میں رہتا ہے۔ صبح کو بچّہ صبح کا اخبار
لے کر ماں کے پاس پہنچتا ہے، وہ اس میں سے بچّوں کے
کالم کا حصہ اُسے سناتی ہے، مثلاً ہاتھی یا چیونٹی کی کوئی بات،
پھر وہ اپنے کمرے میں پڑھنے یا کھیلنے چلا جائے گا، چھ بجے
شام کو اُسے دودھ کا ایک پیالہ یا شوربہ کا ایک پیالہ دیا جائے
گا، رات کو وہ بستر پر لیٹے گا تو اُسے کہانیاں سنائی جائیں
گی، یا بچکانے شعر یا کوئی اچھا سا گانا۔ یہاں تک کہ وہ سو
جائے گا! نئے زمانے کا مدرسہ آبا کا خیر مقدم کرتا ہے،
وہ انھیں بچّوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہر مرحلہ پر

خبردار رکھتا ہے۔

سمجھ دار معلّم کا فرض ہے کہ وہ آیا کو اس حقیقت سے آشنا کرے کہ بچّہ کی زندگی صرف اس کے لئے نہیں ہے۔ پورے خاندان پوری قوم، اور پورے ملک کے لیے ہے!



(۲۷)

بچپن اور بچپن کی شکلیں

نفسیاتِ عقلی کے چند اہم پہلو

اس باب میں، چند اہم اور دُور رس مسائل پر ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

بچوں کی تعلیم بچوں کی تعلیم میں، اگر معلّم، ان کے حالات، رجحانات میلانات اور نفسیات کا خیال رکھے، تو امید سے زیادہ کامیابی ہوتی ہے، مدرس کو چاہیئے کہ وہ اپنے ہر تلمیذ کو اس طرح تعلیم دے، گویا وہ اس کی نفسیات سے آشنا ہے۔ اس کی صلاحیتوں سے واقف ہے، جس سوسائٹی میں رہا ہے اُسے جانتا ہے، جس ماحول میں اس نے پرورش پائی ہے۔ اُسے پہچانتا ہے، انہی معلومات حاصل کرنے کے بعد مدرس اس قابل ہوگا کہ وہ اپنے تلمیذ کی سرشت سے اچھی طرح واقف

ہو جائے، اور اسے وہ چیزیں بتائے، جنھیں وہ آسانی کے ساتھ ہضم کرسے، پھر آسانی کے ساتھ وہ بہت سی غلط اور نامناسب چیزوں سے بچوں کو دور رکھ سکتا ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ وہ ان کے اخلاق، شخصیت اور مزاج سے پورے طور پر واقفیت پیدا کرے، ان کے جسمی نقائص، اور عقلی کوتاہیاں اس کی نظر میں ہوں، پھر وہ یہ کرے گا، کہ کلاس میں، ہر بچہ کو اس کی مناسبت کے پیش نظر نشست دے گا، جو بچے کمزور آنکھوں والے اور کوتاہ جسموں والے ہوں گے، انھیں اگلی صف میں بٹھائے گا۔ اور اس ضعیف العقل لڑکوں کو اس مدرسہ میں یا کلاس میں بھیج دے گا، جہاں ذہنی و دماغی کوتاہیاں زیر تربیت و اصلاح لائی جاتی ہیں۔

مدرس کی استعداد

اگر مدرس، ان حقائق کا ورک حاصل کرے، تو وہ ان بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہے گا، جو ان حقائق بدیہیہ سے عدم واقفیت کی بنا پر ظہور میں آتی رہتی ہیں، اگر اسے یہ معلوم ہے کہ کھیل، اور حرکت بچے کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کھانا، اور ہر عقلی کام دماغ کے خلایا میں اپنا ایک اثر قائم کرتا ہے، اور

تکان سے انتباہ کی استعداد کم ہو جاتی ہے، اور حافظہ کام
نہیں کرتا، تو وہ اپنے ہر درس اور ہر پند میں ان بنیادی
حقیقتوں کو پیش نظر رکھ کر آگے بڑھے گا، وہ بچہ کو موقع
دے گا کہ وہ کھیل کے وقت ضرور کھیلے، اور پڑھنے کے
وقت ضرور پڑھے۔ یہ جان کر کہ سستی اور کاہلی، تکان کی
علامت ہے، بچہ کو حسب موقع ورزش بھی کرائے گا،
اور آرام کا موقع بھی دے گا، وہ اس کی کوشش کرے گا
کہ بچے ہر وقت چاق و چوبند رہیں۔ صبح کے وقت جیسے
تر و تازہ ہوں، سہ پہر کو بھی ویسے ہی دکھائی دیں، آج
کا کام پورا کرنے کے بعد وہ اتنے نہ تھک جائیں کہ کل
کے لیے کام کرنے کی سکت ان میں باقی نہ رہ جائے۔ بچہ
سے اگر کوئی خطا ہو جائے، اور وہ خطا نتیجہ ہو ناواقفیت،
یا بھول چوک کا۔ تو تنبیہہ کے بعد معاف کر دینا چاہیئے۔
اور اگر وہ خطا، سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کا نتیجہ ہو، بدنیتی اس
میں شامل ہو، تو ایسی سزا بھی دینا چاہیئے، جو جرم کے
مطابق ہو، لیکن سزا میں بھی اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔
کہ اس سے طبیعت راستی قبول کرے، اور اصلاح کی طرف
مائل ہو۔ بچہ کے دل میں یہ بات بٹھا دینی چاہیئے کہ
اُسے جو سزا دی گئی ہے وہ کوئی ظلم اور زیادتی نہیں

ہے۔ عین عدل و انصاف ہے۔

بچہ کی تربیت

بچّہ کو تعلیم دینے، اور بچپنے کی اصلاح و تربیت کا کام کرنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ معلّم، احوال طفولیت سے آشنا ہو بچہ کی طبیعت مزاج، زندگی، اور اس کی عقلی استعداد سے پورے طور پر واقف ہو۔ وہ جانتا ہو کہ مراحل نشو و نما کیا ہیں، اور ان سے کس طرح گزرنا چاہیئے؟ وہ اس سے بھی باخبر ہو۔ کہ بچے کس بات کو پسند کرتے ہیں، کسے ناپسند کرتے ہیں، کسی کام کے کرنے کی انھیں ترغیب کس طرح دی جاتی ہے؟ یہ سب باتیں جاننا اس لئے ضروری ہیں کہ بغیر ان کے تمام مدرس انھیں صحیح ڈھرے پر نہیں لگا سکتا، نہ صحیح راستے کی طرف ان کی رہنمائی کر سکتا ہے، مدرسین کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے، کہ وہ تعلیم یافتہ تو ہوتے ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے کہ پڑھائیں کیسے، علم کا حاصل کرنا اور چیز ہے، اور علم کا سکھانا، بالکل دوسری چیز ہے۔"

کامیاب مدرس

تعلیم بچگان سے مدرس کو بہت سے امور میں کافی مدد ملتی ہے، اور خود اسے کامیاب مدرس کے مواقع حاصل ہو جاتے

ہیں، مثلاً :-

(۱) وہ یہ جان لیتا ہے کہ تربیت طفولیت کا مقصد کیا ہے۔

(۲) وہ بچوں کی سیرت، مزاج، اور شخصیت سے آشنا ہو جاتا ہے، یہ جان لیتا ہے کہ ان کا جسم کیا چاہتا ہے، اور عقل کیا مانگتی ہے؟ وہ یہ بھی معلوم کر لیتا ہے کہ بچے اگر صاف ستھرے ہوں، اچھی آب و ہوا میں رہ رہے ہوں، ان کی غذا درست ہو، اور انھیں آرام کا پورا موقع ملتا ہو، تو ان سے کام لینے میں کتنی آسانی ہوتی ہے اس لئے کہ بچے بھی بہر حال خون اور گوشت کا مجموعہ ہیں، وہ محسوس بھی کرتے ہیں اور سوچتے بھی ہیں، ان کے پاس بھی جسم ہے، اور وہ تربیت کے محتاج ہیں، وہ عقل بھی رکھتے ہیں، جس سے سمجھنے کا کام لیتے ہیں، ضروری ہے کہ یہ عقل نا تربیت یافتہ نہ رہنے پائے۔ ان کے سینے میں دل بھی موجود ہے، محبت بھی کرتا ہے، وہ اس سے نفرت کرے، یا ان پر اعتماد کرے وہ بھی اس سے بھڑکنے لگتا ہے، لہذا دل کو بھی تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا، اس کی پاسبانی بھی ضروری ہے۔

(۳) بچوں کی تعلیم ان کی بہت سی خامیوں کو دور کر دیتی

ہے۔ ایک دفعہ، ایک مدرس نے، ایک شاگرد کو بہت پٹیا،
اس لیے کہ جب وہ اس کی تنبیہہ کر رہا تھا، تو اس کا
چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ درجہ کے دوسرے طلبہ اس کی عادت سے
واقف تھے، کہ جب اس کی عقل مضطرب ہوتی ہے، تو
اس کے چہرے پر یبوست کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں
لیکن مدرس صاحب اس بات سے ناواقف تھے،
واقف ہوتے تو پیٹنے کی بجائے اس کی اصلاح کرتے،
کیوں کہ بچوں کی اکثر عادتیں بغیر کسی مقصد اور ارادہ
کے ہوتی ہیں۔

یہ ہوسکتا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق
جو تحریری مواد جمع ہے۔ اس سے مدرس فائدہ اٹھائے،
اور کام لے، لیکن بہت سے بچوں سے بذات خود سابقہ
رکھنا، بچوں کی مختلف عادتوں اور کیفیتوں کا بہ چشم
خود بار بار اور ہر روز مشاہدہ کرنا، بچہ کی مکتبی، اور
منزلی حالت کو دیکھتے رہنا، بچوں کو بچکانی کتابیں،
اخبارات اور رسالے پڑھا کر، ان کی ذہنیت سے واقفیت
پیدا کرنا۔ یہ چیز ہی اور ہے۔ اس طرح مدرس کے لیے
بچہ کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے، اور اگر ہم بچہ کی
طبیعت اور مزاج سے آشنا رہ کر اسے تعلیم دینا شروع

کردیں۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور بچہ کو بجائے اس کے کہ کچھ فائدہ پہنچے اُلٹا نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔

ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم بچّہ پر مسلّط نہ ہوں۔ اس کی فکر و عقل پر چھاپہ مار کر نہ بیٹھ جائیں، بلکہ خود اُسے موقع دیں کہ سوچے اور کرے، بچّہ سے یہ کبھی نہیں کہنا چاہیئے۔ یہ کام میں ناپسند کرتا ہوں، لہٰذا تو بھی اسے ناپسند سمجھ، اور نہ کر، اس کے بجائے بچّہ سے کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرانے کا طریقہ ہے کہ اسے اچھائی برائی بتا کر، رائے قائم کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس طرح وہ وہی کرے گا، جو آپ چاہتے ہیں، لیکن بطور خود ہو کر۔

بچہ کی حیثیت یہ بہت آسان بات ہے کہ بچّہ کو کسی کام کے کرنے کا حکم دے دیا جائے، یا کسی کام کے کرنے سے اُسے منع کر دیا جائے وہ مجبور ہے، آپ کا کہا مان بھی لے گا، لیکن کیا اس طرح وہ نہ کرنے والے کاموں کو ناپسند کرنے لگے گا؟ کرنے والے کاموں کو پسند کرنے لگے گا؟ نہیں، یہ اس وقت ہو سکتا ہے، خود اس کا دل کہے، ہاں، یہ نہیں کرنا چاہیئے۔ بچّہ سے اگر آپ واقعی کوئی کام کرانا

یا کسی کام سے روکنا چاہتے ہیں۔ تو آپ کے لئے بہتر اور مناسب طریقہ یہ ہے کہ آپ اسے قائل کر دیں، سمجھادیں جب وہ کچھ سمجھ لے گا، تو آپ کا مقصد بغیر کسی جبر اور دباؤ کے آسانی کے ساتھ حاصل ہو جائے گا، وہ اس کھوج میں رہتا ہے، یہ کام کیوں نہ کروں؟ اور یہ کام کیوں نہ کر دوں؟ اگر اسے اصل وجہ اور کنہ معلوم ہو جائے گی، تو بے چوں و چرا وہ وہی کرے گا جو آپ چاہتے ہیں، جو اسے کرنا چاہیئے۔

اس سلسلہ بحث و گفتگو میں ایک مثال کا تذکرہ شاید بے موقع نہ ہو۔ ایک بچہ کی عادت تھی کہ جب وہ سونے کے لئے بستر پر لیٹتا تھا، تو کمرہ کا بلب روشن رہنے دیتا تھا، اور سونے سے پہلے ماں باپ سے کہانی سن کر سو جایا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے روشنی پر اصرار نہیں کیا، ماں نے چاہا۔ بلب بجھادے تاکہ بچہ کو اطمینان اور آرام سے سونے کی عادت پڑ جائے، اور اندھیرے سے ڈرا نہ کرے، لیکن ادھر بجلی کا سوئچ آف ہوا، ادھر بچہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ ماں بچے کے پاس گئی اور اس سے کہا:

بیٹے، تم چاہتے ہو، تو ہم بجلی جلائے دیتے

ہیں، لیکن یہ سوچ لو۔ اس طرح ہر مہینے تمہارے ابا جان،
بجلی کمپنی کو بہت سے روپے بھرتے ہیں، اور تمہارے
لیے، مٹھائیاں، کھلونے، اور دوسری چیزیں نہیں خرید پاتے
بچہ چپ ہو گیا، اور ماں سے بتی بجھا دینے کو کہا۔
اور پھر اپنے سونے کے کمرہ کو سوتے وقت روشن
کرنے کی ضد اس نے کبھی نہیں کی۔

بچہ کی تربیت بچہ کی تربیت کوئی آسان کام نہیں
ہے۔ اس کے لئے بڑے صبر اور
غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑی دور اندیشی
اور احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور اگر ذرا بھی چوک
ہوئی، تو بچہ بگڑ جاتا ہے، اور بچہ کے بگڑ جانے
کا مطلب یہ ہوا کہ مستقبل کی قوم بگڑ گئی۔ اس لیے
کہ یہی بچہ بڑا ہو کر فرد بنے گا، اور انہی افراد کا
مجموعہ قوم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

بچوں کی تربیت کے بارے میں مدرسوں اور
استانیوں سے بسا اوقات بڑی غلطیاں سرزد
ہو جاتی ہیں، اور یہ غلطیاں زیادہ تر نتیجہ ہوتی ہیں۔
بچوں کی نفسیات سے ناواقفیت کا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں
کہ اپنی عمر کے لوگوں کے عادات و اطوار بچوں میں

دیکھیں۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ بچہ بہر حال بچہ ہے۔ اس کی پرورش کے خاص اصول ہیں، اور انہیں ہر حالت میں پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ گھر اور مکتب دونوں جگہ، یہی بنیادی غلطی ہوتی ہے۔ جو سارا کام بگاڑ دیتی ہے، اور اس کا ازالہ صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جہاں ہم بچہ کی تعلیم میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کریں وہاں اس کی تربیت میں بھی کوئی سقم نہ رہنے دیں۔

تربیت کی اہمیت

موجودہ زمانہ میں بچہ کی تربیت، تعلیم سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکی ہے بغیر صحیح تربیت کے معلّم کچھ بھی سُود مند نہیں ہو سکتا۔ بنیاد و اساس یہی ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ فروع۔

ژان ژاک روسو پہلا شخص ہے، جس نے یہ نعرہ بلند کیا کہ بچہ کے لئے سب سے پہلی اور بنیادی چیز تربیت ہے، بغیر اس کے تعلیم مکمل نہیں ہو سکتی اور بچہ کے اعمال و عواطف کا اندازہ نہیں ہو سکتا اور تربیت تمام تر، اعمال و عواطف کا مزاج و طبیعت ہی پر منحصر ہے۔ روسو کی کتاب "امیل" کو تعلیم کی "انجیل مقدس" کہا جاتا ہے۔

روسو کی نظر میں کوئی بچہ بُرا نہیں ہوتا، بلکہ وہ گھر

برا ہوتا ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ وہ نمونہ بُرا ہوتا ہے، جس کی وہ پیروی کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر زیادتی اور کیا ہو گی، کہ قبل اس کے کہ بچّہ میں غلطیوں اور خطاؤں کا ادراک پیدا نہ ہو۔ اسے سزا دی جانے لگتی ہے۔ جو تحفہ دیا جاتا ہے اُسے وہ ہوتا ہے مارپیٹ اور زجرو توبیخ کا، اس کی خواہشوں کو پامال کیا جاتا ہے، اس کی رغبتوں کو کچل دیا جاتا ہے ہم خود ہی بچہ کو بگاڑتے ہیں اور خود ہی شکایت کرتے ہیں، کہ یہ بگڑ گیا۔ یاد رکھنا چاہیئے، بچّہ کے سامنے جو نمونہ ہوگا، وہ اُسی کی پیروی کرے گا۔ جو سُنے گا، وہی بولے گا۔

ہم قدم قدم پر طبیعت کے خلاف چلتے ہیں، اور جب اس کا بُرا نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم کراہتے اور افسوس کرتے ہیں۔ طبیعت کا تقاضہ یہ ہے، کہ بچّہ جب تک مرد نہیں بن جاتا اُسے بچّہ ہی سمجھا جائے۔ اور بچپن کی تعلیم، تدریس، تربیت کا اصول بالکل الگ اور جداگانہ ہے اس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں ہو سکتی کہ ہم بچّہ کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو پورے آدمی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان سے وہی توقع رکھیں، جو بڑوں سے رکھتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہو کہ بچّہ جب تک بچّہ ہے۔ اُسے بچہ ہی سمجھنا چاہیئے۔

پھر جب وہ پورا آدمی بن جائے۔ تب بیشک اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے۔ جو آدمیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ایک مقام پر انجیل میں آیا ہے:

"جب میں بچہ تھا۔ بچوں کی طرح بولتا تھا۔ اور بچوں کی طرح سوچتا اور سمجھتا تھا۔ لیکن جب میں مرد بن گیا، تو بچپن کی باتیں بھول گیا۔"

آج کل جو تربیت کا اصول کارفرما ہے وہ درحقیقت اسی بنیاد پر قائم ہے۔ آج کل کے زمانہ میں بچے سے یہ اُمید نہیں کی جاتی کہ وہ مردِ کامل کی طرح بولے گا، یا مردِ کامل کی طرح سوچے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم کسی مرد سے یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ بچہ کی طرح بولے گا۔ یا بچہ کی طرح سوچے گا۔

قدیم تربیت کا نقص

قدیم اصول تربیت میں کئی نمایاں تھیں۔ فنلون نے اپنے زمانہ کے مدرسوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا: "ان مدرسوں میں نہ حریت ہے، نہ مسرت، اسباق کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، سکوت کا ایک مسلسل دور ہے۔ تھکا دینے والی نشست کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، اور پھر مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ ہے!" ایک اور معلم کا قول ہے:

ہمارے مدرسوں میں جو بچے ہماری تربیت میں ہیں، دن رات کسی وقت بھی ہم ان کا تعاقب نہیں چھوڑ سکتے، نتیجہ یہ ہے کہ ان کی خرابی اور شر پسندی میں دن رات اضافہ ہو رہا ہے۔"

مونٹین۔ ایک دوسرے فرانسیسی ادیب نے اپنے عہد کے مدرسوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا: "یہ مدرسے جیل خانے ہیں، مدرسہ میں داخل ہوجیئے تو، اور وہاں سے باہر نکلئے تو آپ دیکھیں گے، طلبہ سبق گھوٹے جا رہے ہیں۔ ان مدرسوں میں سوا لڑکوں کی چیخ پکار کے، اور ان کی مار پیٹ کے شور کے اور کچھ نہیں سنائی دے گا یا مدرسین کا ہنگامہ ہوگا، جو غصہ میں بدمست ہوں گے اور ڈانٹ ڈانٹ کر پڑھا رہے ہوں گے۔

ان حضرات کے نزدیک ان معصوم اور مسکین بچوں میں علم کی تشویق پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ڈنڈا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی تربیت بے نتیجہ رہتی ہے لڑکے مدرسہ اور مدرس سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور مار دھاڑ کے ڈر سے مدرسے میں جو کچھ سیکھتے ہیں، وہ اسے چھوڑتے ہی بھول جاتے ہیں۔

بچہ اور مشق

بچّہ کے قویٰ، صرف استعمال اور مشق و مزاولت ہی سے نشو و نما پاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے، جس میں کوئی استثنا نہیں۔ ہم چلنا صرف اسی طرح سیکھ سکتے ہیں کہ چلنے کی مشق کریں۔ بات کرنا اسی طرح ہمیں آسکتی ہے کہ بار بار چیت کریں، جس طرح گھوڑے کی سواری، بغیر گھوڑے پر چڑھتے ہوئے نہیں آسکتی، نہ بغیر تیرے ہوئے تیرنا آسکتا ہے، اگر بچپن میں بچہ کے عقلی قویٰ کی تربیّت اور پرداخت اور صحیح استعمال نہ ہو۔ تو پھر یہ کجی آخر وقت تک باقی رہتی ہے، بالکل یہی حالات، حواس، شعورِ حسابی کے ہیں۔ انھیں بھی صرف استعمال و تمرین ہی سے مستحکم کیا جاسکتا ہے۔

تربّیت دہندہ کا فرض ہے کہ وہ شروع ہی سے ان امور کا لحاظ رکھے، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی حرّیت شخصی سے غلط اور ناجائز فائدہ اٹھائیں گے، بالکل بچپن سے تربیت کے اصولوں پر ہمیں اپنی نظر رکھنی چاہیے۔ اور ساتھ ہی ساتھ بچّہ کو اتنی فرصت بھی دینی چاہیئے۔ کہ وہ خود بھی اپنی عقل و فکر سے کام لے سکے۔ ہمیں یہ نہیں چاہیئے۔ کہ اسے اپنا آلہ کار بنانے کی کوشش کریں۔ اور ہمارے دماغ سے سوچنے لگے۔ ہماری آنکھوں سے دیکھنے لگے،

اور ہمارے کانوں سے سُننے لگے، ہمیں اس کی سعی نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ عقل و فکر کی جو نعمت بچّہ کو خدا نے دی ہے ہم ان سے چھین لیں، ہمارا کام تو اسے بڑھانا ہے نہ کہ گھٹانا اور ضعف پہنچانا۔

بعض دفعہ آپ کسی مدرس یا باپ کو اس پر فخر کرتے دیکھیں گے کہ اس نے اپنے بیٹے یا تلمیذ کا ارادہ فلاں معاملہ میں بدل دیا، فخر اس پر ہوتا ہے، کہ اس کا دِل توڑ دیا۔ اور یہ باپ یا مدرس نہیں جانتا کہ اس نے اپنی قساوت سے کام لے کر بچّہ کو اور اس کے حواس واعصاب کو کتنا شدید نقصان پہنچایا ہے۔ بچہ تربیت اور تہذیب کے قابل اسی وقت ہوتا ہے جب وہ بچّہ ہوتا ہے۔ جب بچپن میں اسے تربیّت ملتی ہے۔ گھر میں اور مکتب میں، والدین اور مدّرس کی طرف سے اس کی پوری نگہداشت کی جاتی ہے وہ ایسی رہنمائی کا جویا ہوتا ہے جو اسے حرّیت فکر دے، جو اس میں نشو و نما پیدا کرے۔ اور جو اسے آسان اور کامیاب زندگی سے آشنا کرے۔

بچہ کی طرف توجہ

انگلستان کی ایک لیڈی ڈاکٹر کا بیان ہے۔ کہ میرے بچّے کی معلّمہ چھٹی لے کر چلی گئی اس کی واپسی تک کے لئے ایک دوسری

معلّمہ کے لئے جستجو ہوئی، چنانچہ میں نے ایک عورت رکھ لی۔ یہ نئی معلّمہ، ہر بچّہ کو ہر ہفتہ مسہل دیا کرتی تھی، تو وہ انکار کر دیتا تھا۔ پھر وہ زبردستی اس کا منہ کھول کر جبراً دوا پلا دیتی تھی۔ اس مسہل سے بچّہ کو جو فائدہ ہونا چاہیئے تھا وہ نہیں ہوا۔ اور اس کی وجہ جوَر و استبداد کے سوا کچھ نہیں ہے کیا یہ مناسب ہے کہ ہم بچّہ کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ کریں؟ کیا یہ کھُلا ہوا ظلم نہیں ہے۔ کہ ہم ایسی بیچاری مخلوق پر زبردستی کریں جو رونے کے سوا اپنی کوئی مدافعت نہیں کر سکتی، اور جس کا نہ کوئی معین ہے نہ مددگار؟ عاقل وہی ہے جو بچّہ کے ساتھ اس کی طبیعت اور مزاج کے موافق سلوک کرے۔ اوپر جو واقعہ مذکور ہوا، گھر اور مکتب میں اکثر اور بیشتر اسی طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

اطالیہ کی مشہور ماہر تعلیم و تربیت ڈاکٹر مانٹسوری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں ایک پارک میں گئی وہاں میں نے ایک ہنس مکھ اور چنچل بچہ دیکھا۔ عمر مشکل سے ڈیڑھ سال کی ہوگی۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ سنگریزوں سے اپنی جھولی بھر لے۔ اس کے ایک طرف اس کی دایہ کھڑی تھی۔ ایک اچھی سی چادر اوڑھے ہوئے۔ صاف معلوم ہوتا تھا، یہ اس بچہ کو چاہتی ہے اور اس کی پوری نگہداشت کرتی ہے۔ جب گھر جانے کا وقت

آیا، تو اس نے کئی مرتبہ بچہ سے اپنا کام ترک کردینے کو کہا، تاکہ وہ اسے اس کی ننھی سی گاڑی میں بٹھائے اور لے جائے، لیکن بچّہ نے آیا کی بات کی کچھ بھی پروا نہیں کی۔ اس نے تمام سنگریزے اُٹھا کر گاڑی میں رکھ دئے۔ اسے کامل یقین تھا۔ اب بچّہ مطمئن ہو جائے گا لیکن اس نے رونا اور چیخنا شروع کردیا۔ گویا وہ اپنی آیا کے کام کو سخت ناپسند کر رہا ہے اور اسے سخت غصّہ آرہا ہے۔

بچّہ کی حالت

اس معاملہ میں آیا سے غلطی کیا ہوئی۔ بچہ کیوں رویا؟ حالانکہ وہی کام کیا گیا جو وہ چاہتا تھا۔ آیا نے یہ نہ سمجھا کہ بچّہ کے رونے کی وجہ یہ نہیں تھی۔ کہ سنگریزے جھولی میں کیوں بھرے گئے؟ یا گاڑی میں کیوں رکھے گئے؟ وہ اس لیئے رویا کہ آیا نے یہ کام کیوں کیا؟ خود اسے یہ کام نہیں کرنے دیا گیا؟ وہ خود یہ کام کرتا تب ہی اس کا دل مطمئن ہو سکتا تھا۔ اور اس کا ارادہ پورا ہو سکتا تھا۔ آیا نے یہ مقصد نہیں سمجھا۔ سطحی طور پر وہ یہی سمجھی کہ بچہ یہی چاہتا ہے کہ سنگریزے لے لے۔ چنانچہ اس نے جھولی بھر دی، اور بچّہ بجائے خوش ہونے کے رونے لگا۔ اگر یہ کام بچّہ پر چھوڑ دیا جاتا، تو زیادہ اچھا ہوتا۔ بچّہ کا مقصد خاص طور پر یہ نہیں تھا کہ سنگریزے اُٹھالے

بلکہ یہ تھا کہ جو کام وہ کر رہا ہے، بغیر کسی مداخلت کے اسے کرے۔ لیکن آیا اس کے اور اس کی طبیعت کے درمیان آکر حائل ہو گئے۔

یہ اور اس کی طرح دوسری مثالیں، بچہ کی صحیح تربیت کے اصول کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ تربیت دہندہ کو یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ بچہ حرکت اور عمل کو پسند کرتا ہے۔ نشاط کار اور کھیل کود سے اسے دلچسپی ہے۔ اسے سمجھاؤ۔ اس کے کھیل کود میں شرکت کرو۔ اس کے شعور میں حصہ لو۔ اسی طرح اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی عقل اور بدن کو پورے طور پر نشو و نما کا موقع مل سکتا ہے۔

اور اگر بنیادی اصولوں اور حقیقتوں کو نظر انداز کر دیا جائے بچہ کے امیال و عواطف، رغبت اور طبیعت کو اہمیت نہ دی جائے۔ تو کام بگڑ جاتا ہے۔ تربیت دہندہ کا فرض ہے کہ وہ بچہ کو پڑھائے بھی، اور بچہ کو کھلائے بھی، تاکہ اس کا نفس مرنے نہ پائے اس کا ارادہ ضعیف نہ ہونے پائے، اس کی آرزوئیں قتل نہ ہونے پائیں۔ اس لئے کہ اگر یہ ہوا تو دراصل خود بچہ کی موت ہے۔

بچہ کا شعور

ایک دن ایک باپ اپنے بچہ کے ساتھ ایک پارک میں گیند کھیل رہا تھا۔ بچہ جانتا تھا۔

باپ کو کھیل سے زیادہ پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ کھیلتے کھیلتے بچہ نے دفعتاً پوچھا "ابا جان! کیا آپ تھک گئے ہیں؟ ایسا ہے تو بس اجازت دیجیے۔ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ جاکر کھیلوں، میں آپ کو زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا۔

دوسرے دن یہی لڑکا، مدرسہ آیا اور ایک لڑکے نے اس کی آنکھ پر مُکا مار دیا۔ وہ سوج آئی۔ ماں کو یہ خبر ملی۔ تو بے کل ہوگئی۔ اس نے ابھی تک بچہ کو دیکھا نہیں تھا۔ لیکن اسے وہم ہوا۔ کہ بچّہ کی آنکھ کو ضرور کچھ نقصان پہنچا ہے۔ یہ خیال اس بری طرح اس پر مسلط ہوا۔ کہ وہ زمین پر گر پڑی، اور بیماری ہوگئی وہ لڑکا ہمیشہ اپنے نوکر کو اس بات پر ملامت کرتا تھا، جس نے ماں کو یہ خبر پہنچائی تھی کہ اگر تم چپ رہتے تو یہ واقعہ رونما نہ ہوتا، وہ خادم سے جو مدرسہ میں اسے لینا آتا۔ ماں کی حالت پوچھتا اور گھر پہنچا تو ماں کو دلاسہ دیتا کہ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں بالکل اچھا ہوں۔

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ بچہ میں بھی سمجھ ہوتی ہے۔ ان میں بھی ذمّہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ہر معاملہ کی نوعیت سمجھنے کی اہلیت اور صلاحیّت رکھتا ہے۔

بچّہ کے سوالات بچّہ بہت سوالات کرتا ہے، ہمارا فرض ہے کہ اس کے سوالوں کو ٹالیں،

نہیں ، بلکہ اسے شافی اور کافی جواب دیں ، اگر وہ مذہب کے
بارے میں ، جنگ کے بارے میں ، قتل کے بارے میں
پوچھتا ہے ، یا یہ دریافت کرتا ہے وہ کیسے پیدا ہوا ؟ تو اس
کے ہر سوال کا نہایت واضح اور تسلی بخش جواب دینا چاہیئے
کبھی نہیں کہنا چاہیئے ۔ کہ "تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتے ۔" بلکہ
ہمارا فرض ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ اسے سمجھا سکتے ہیں ،
سمجھا دیں ، جتنا جتنا زیادہ سے زیادہ اسے مطمئن کر سکتے ہیں
کر دیں ۔ آج ممکن ہے وہ پورے طور پر نہ سمجھ سکے ۔ لیکن سوال
و جواب سے اس میں مناسبت تو پیدا ہو جائے گی ۔ کل
جب یہ مسئلہ اس کے سامنے آئے گا ، تو وہ ضرور آسانی
کے ساتھ اسے اپنی گرفت میں لے لے گا ۔

بچہ کا جذبۂ کار

بچہ کام کرنے کے لئے بے چین رہتا ہے
لیکن اُسے ایک معاون کی ضرورت
رہتی ہے ، جو گھر میں اور مدرسہ میں اس کی مدد کر سکے ،
یہ بہت بڑی بھول ہے ، کہ ناسمجھی اور لاشعوری کی حالت
میں بچہ کو تنہا چھوڑ دیا جائے ۔ وہ اگر پیاسا ہوگا ، تو پانی کے
بدلے زہر بھی پی سکتا ہے اس لئے کہ وہ پانی اور زہر کا فرق
نہیں جانتا ، وہ خود کچھ نہیں جانتا ، وہ دوسروں کو جو کچھ کرتے
ہوئے دیکھتا ہے وہ طرح طرح کے سوالات کرتا رہتا ہے ،

اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔ یہ کیوں ہوا؟ کب ہوا؟ یہ
چیز کہاں سے لائے؟ اس کی کیا قیمت ہے؟ یہ اور اس طرح
کے دوسرے سوالات کرتا رہتا ہے۔ ان تمام سوالات کا شافی
جواب بچّہ کو ملنا چاہیئے، بچّہ کے سوالات کا جواب دینے سے
اس لیئے انکار نہیں کر دینا چاہیئے کہ ابھی یہ اس کی سمجھ میں
نہیں آئے گا، نہ یہ سوچنا چاہیئے۔ کہ اسے قدم قدم چلایا جائے۔
یہاں تک کہ یہ سیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جائے۔ جو بچہ
معلوم کرنا چاہتا ہے اور اسے نہیں بتایا جاتا، وہ سیدھا راستہ
چھوڑ کر اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارنے لگتا ہے۔ اس کے
سمجھ دار ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے، جو پوچھے بتا دینا چاہیئے
مدرس کی ایک بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ تربیت کے بارے
اس کا کیسہ معلومات بہت مختصر ہوتا ہے۔ اس فن کی کتابیں
وہ نہیں پڑھتا، اور جو کچھ تھوڑا بہت پڑھتا ہے اس پر عمل
کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔

بچپن کی مصیبت

آدمی خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کے
لیئے یہ ناممکن ہے کہ ہر وہ چیز جو
کے جی میں آئے کر ڈالے۔ اس لیئے کہ اجتماعی قواعد کبھی کبھی
اس کے اور اس کے ارادوں کے مابین حایل ہو جایا کرتے
ہیں۔ جیسے حفظانِ صحت کے قواعد کہ بعض وقت رغبت

کے باوجود سے خارج ہوتے ہیں،

بچہ، امر ونہی، ہر معاملہ میں مجبور ہے، کبھی اسے ایسے کام کا حکم دیا جاتا ہے جسے وہ سخت ناپسند ہوتا ہے۔ اس کے ارادہ اور رغبت کو اپنی جگہ بنانے کا موقع نہیں ملتا مجبوری اسے ہر چہار طرف سے گھیرے رہتی ہے۔ گھر میں بھی وہ گھٹا گھٹا رہتا ہے، اور مدرسہ میں بھی اس کے ہاتھ پاؤں بندھے رہتے ہیں، وہ ایک کام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ماں، باپ، بھائی کی فوج مخالفت کے لیے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اگر مدرسہ میں اس کی طبیعت کچھ اُمنگ دکھاتی ہے تو مدرس یا ساتھی منع کر دیتے ہیں وہ ایک عجیب میں اپنے تئیں گرفتار پاتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ہر وقت اس کی نگرانی ہوتی ہو، بلکہ یہ بھی کہ اسے بار بار جھڑکا بھی جاتا ہے۔ مارا بھی جاتا ہے، منع بھی کیا جاتا ہے، اب آخر وہ کیا کرے؟ قدرتاً وہ اس صورت حال سے گلو خلاصی چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کوئی ایسی جگہ ملے، جہاں وہ اطمینان سے سوچ سکے، آزادی سے اپنے ارادے پورے کر سکے، کیونکہ جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے۔ نہیں کرنا چاہتا، اس کے کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

بچّہ کا احتجاج

بچہ اسے کبھی بھی پسند نہیں کرتا کہ ہر وقت وہ قید و بند میں رہے۔ اور کوئی کام بھی آزادانہ نہ کر سکے، چنانچہ کبھی کبھی تو وہ اپنے احتجاج کا اظہار رو رو کر کرتا ہے اور کبھی جل کر، اور کڑھ کر بچّہ دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ نازک احساسات کا مالک ہوتا ہے اس کا تاثر بڑا تیز ہوتا ہے، بچّہ کے ساتھ ہمیشہ نرمی، اور ملاطفت کا برتاؤ کرنا چاہیئے اور جب اُسے کسی کام سے منع کیا جائے تو اس کی وجہ سمجھا دی جائے کسی کام کی ترغیب دی جائے تو اس کے اسباب بتا دئے جائیں ایسا امر، اور ایسا نہی، جس کے ساتھ اسباب کا ضمیمہ نہ ہو، بے اثر بھی ہے، اور مضر بھی بچّہ کو ایک قسم کی ضد سی ہوجاتی ہے اسے اگر منع کرو، تو وہ ضرور کرے گا۔ اس کی اس ضد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس حکم اور نہی کی خلاف ورزی کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ اگر اسے پہلے سے سمجھا دیا جائے تو وہ آسانی سے مان جائے گا۔ اور وہی کرے گا جو کام ہم اس سے لینا چاہتے ہیں۔

(۲۸)

کھیل اور بچہ کی نشوونما

کھیل سے بچّے کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے، اور اس کی نشوونما کو بھی بہت مدد ملتی ہے۔ بچّہ کی ترقی اور تعلیم میں کھیل کا بڑا حصّہ ہے۔ کھیل نام ہے حرکت کا اور نشاط کار۔ جس سے بچّہ کی عقل توانا ہوتی ہے اور جسم مضبوط ہوتا ہے، اگر بچہ سُست اور کاہل ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے قوائے عقلی کمزور ہیں، تندرستی ٹھیک نہیں۔ کھیل بچّہ کے لئے وہی اہمیت رکھتا ہے جو مرد کے لئے کام۔ ایک صحیح و توانا بچّہ پانچ منٹ بھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ جو چیز بھی اس کے سامنے آئے گی، اس کی کھوج اور پڑتال میں لگ جائے گا۔ کبھی اُسے اُلٹے پُلٹے گا۔ کبھی مُنہ میں رکھ لے گا، باپ کی گھریلو لائبریری سے

کتابیں اُٹھا لائے گا اور انھیں اِدھر اُدھر پھینک دے گا۔ کبھی ان سے کھیلنے لگے گا یا آگ میں ڈال دے گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ آگ ان پر اثر کرتی ہے یا نہیں؟ غرض اسی طرح اس اُلٹ پُلٹ اُکھاڑ پچھاڑ میں لگا رہے گا۔ جس طرح ایک تشنۂ علم عالم کو۔ ہمیشہ اسے یہی فکر رہتی ہے کہ ایک نئی حقیقت کس طرح دریافت کرلے؟ ایک نیا نظریہ کیونکر تراش لے۔

بچہ اور کھیل: کھیل کھیل میں بچہ کو بہت سی ایسی چیزیں معلوم ہو جاتی ہیں، جو اس کے فہم و ادراک میں اضافہ کرتی ہیں، اور اس کی واقفیت بڑھاتی ہیں۔ بچہ جب سال بھر کا ہو جاتا ہے تو آوازیں نکالنے لگتا ہے۔ پھر ان آوازوں سے وہ کلمات بنالیتا ہے، اور باتیں کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب ذرا بڑا ہوتا ہے تو گیند کے پھینکنے میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔ پھر اس کی طبیعت حرکت کی طرف مائل ہوتی ہے اور وہ کھیل سے دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اس طرح کی معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے پاؤں، ہاتھ، اور انگلیاں طاقت پکڑنے لگتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ کپڑے پھاڑ دیتا ہے محض کھیل کھیل میں اور کھیلتے کھیلتے زمین بھی کھودنے لگتا ہے۔

یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن پر ہمیں نہ افسوس کرنا چاہیئے۔ نہ پریشان ہونا چاہیئے، یہ تو بچپن کے لوازم ہیں۔ اور ان سے کسی طرح بھی مفر نہیں، بلکہ میں تو ان لوازمات کو جمالِ طفلی سمجھتا ہوں۔ بچّہ کا حُسن یہی ہے کہ وہ اُچھلے، کُودے، شرارت کرے، پھوڑے اور گھر میں ایک ہنگامہ مچادے، صرف اسی طرح بچّہ کی مہارت بڑھ سکتی ہے، اور اسے نئی نئی معرفتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

بچّہ ماں باپ سے اپنے کاموں میں مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زیادہ مگن ہوتا ہے، تو بڑے بھائی کے کاندھے پر چڑھ کر سواری کرتا ہے، یا دروازوں اور دیواروں پر بے معنی لکیریں کھینچتا ہے۔ لیکن ان باتوں پر ہم اسے جھڑک دیتے ہیں، حالانکہ ملامت کا وہ نہیں، ہم خود مستحق ہیں، اگر اس کے لئے چوبی گھوڑا مہیّا کر دیا جائے۔ جس پر وہ سوار ہو۔ یا تختی لا دی جائے، جس پر وہ ٹیڑھی ٹیڑھی لکیریں کھینچے، تو وہ کبھی خیال بھی نہیں کریگا، کہ بھائی کے کاندھے کی سواری کرے۔ یا دروازوں اور دیواروں کو اپنا تختۂ مشق بنائے، ہم اگر معلّم یا اُستانی ہیں، تو ہم اُسی وقت خوش ہوں گے جب ہمارے زیرِ تربیت بچے چپ چاپ اور خاموش بیٹھے ہوں، نہ حرکت کریں، نہ باتیں کریں، دن رات ان کے کپڑے بالکل صاف شفاف رہیں، ذرا بھی میلے نہ ہوں، ہمیں اگر اپنا کام ٹھیک طرح سے کرنا ہے، تو ہمیں اپنی اُفتادِ مزاج

بدلنی پڑے گی ۔ اور بچوں سے محال کام کی توقع نہیں کرنی ہوگی، نہ چاہنا ہوگا کہ وہ اپنی طبیعت اور فطرت کے خلاف چلیں۔ یہ تمام باتیں ان کے بس سے باہر ہیں۔

بچہ کی نگرانی اکثر ابا بچہ کی نگرانی اور نگہداشت اسی وقت کرتے ہیں جب وہ کھیل رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ اپنے بچوں کو کھیل پر اُکسائیں کیونکہ تربیت کی تمام قسموں کے لیے کھیل سے دلچسپی لینا بہت ضروری ہے اور اس زمانہ میں تو بہت سے تعلیمی کھیل بھی ایجاد ہو گئے ہیں۔ یہ بچہ کی طبیعت اور مزاج سے پوری مناسبت رکھتے ہیں، ایسے کھیل بھی ہیں، جو بچہ کو عادت بنانا سکھاتے ہیں۔ یا سائیکل کی تیاری کا طریقہ بتاتے ہیں۔ یا چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز بنانے کی ترکیب سکھاتے ہیں۔ ان کھیلوں کے ذریعے بڑھئی کا کام، نقاشی، تصویر بنانا، سب ہی کچھ آجاتا ہے۔

دوسرے علمائے نفس و تربیت کی طرح روسو کی بھی نصیحت یہ ہے کہ تربیت و تعلیم کے دوران میں بچہ کو آنکھ اور ہاتھ سے کام لینے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ اور کھیل کھیل میں اسے تعلیم دینا چاہیئے۔ کوئی دانش مند بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا، کہ کھیل اور ہاتھ سے کرنے والے کام، بچہ کی تربیت عقل وفکر میں بہت زیادہ مددگار ہوتے ہیں۔ اس طرح بچوں میں

ابداع و اختراع کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم اپنے بچّوں کو تکوینی کھیلوں کی طرف راغب کریں۔ تاکہ وہ اپنے حواس اور ہاتھ سے کام لینے کی استعداد پیدا کرسکیں۔

طفولیت کے ۲ دو مرحلے

فردیت ـــــ اور ـــــ اجتماعیت!

زندگی کے ادوار میں سب سے اہم دَور بچپن کا ہے، اس دور میں بچّہ کی تربیت پر ۲ دو اطراف سے اثر پڑتا ہے۔

(۱) فردیت،

(۲) اجتماعیت،

گھر اور مدرسہ اگر ہم گھر اور مدرسہ میں بچّہ پر پوری توجہ کریں تو وہ صاف ستھرا رہنے کا عادی ہو جائے گا۔ اس کی عقل استوار ہو جائے گی۔ اس کی زندگی بڑی اچھی طرح گزرے گی، اس کا جسم توانا ہو جائے گا، اس کی صحت اچھی ہو جائے گی، کوتاہیاں بہت کم رہ جائیں گی۔ اور بچہ بڑی حد تک اپنی زندگی سنوار سکے گا۔ اگر یہ بچپن کی تربیت ناقص رہ گئی، تو اس اہمال کا

کا بہت بُرا اثر بچّہ کے مستقبل اور سوسائٹی کے حال پر پڑے گا
انگلستان میں کوئی بچّہ جاہل نہیں رہنے پاتا، اسے اپنی
مناسبت طبع کے لحاظ سے ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ہے
یہ ایک انسانی حق ہے، جس سے وہ بہرہ ور ہوتا ہے، بالکل اسی
طرح جس طرح انسان کا ایک حق زندہ رہنا بھی ہے، کسی کو حق نہیں ہے
کہ کسی دوسرے کی زندگی پر تعدّی کرے، یا حملہ آور ہو، یا کسی
کو غلام بنا لے، اسی طرح تعلیم بھی اپنے حقوق کی ایک فہرست
رکھتا ہے۔ تعلیم کا شمار انسان کے لئے ضروریاتِ زندگی میں
سے ہے، جیسے پانی، غذا اور ہوا، گذشتہ جنگ عظیم نے یورپ
اور امریکہ کو تعلیم کی طرف اور زیادہ متوجہ کر دیا ہے۔ ہر قوم
اسی سعی میں سرگرداں ہے کہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ استوار اور
راسخ کرے، تاکہ نئی نسل تربیت اور تہذیب کامل کی حامل ہو،
اس لیے کہ اقوام متمدّنہ کا یہ اعتقاد ہے کہ ترقی کا واحد وسیلہ
صرف تعلیم ہی ہے، چنانچہ ان کا ہر فرد تعلیم کی اہمیت کو
سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ تعلیم کا فردی اور اجتماعی زندگی سے
کتنا گہرا تعلق ہے۔ روم کے مشہور زمانہ خطیب اور فلسفی سسرو
کا قول ہے کہ:

"بچپن کے ابتدائی مرحلوں ہی سے تربیت کا کام شروع
ہو جانا چاہیئے!"

تعلیم کی عمومیت

انگلستان کے مجرموں کے اعداد و شمار پر ایک نظر اگر ڈالی جائے کہ تعلیم کی عمومیت سے پہلے کتنے زیادہ تھے، اور بعد میں کتنے کم رہ گئے، تو معلوم ہو گا کہ اقوام اور ملل کی ذہنیت اور طینت پر تعلیم کا کتنا گہرا اور دُور رس اثر پڑتا ہے۔ پھر وکٹر ہیگو کے اس قول کی صداقت کا اندازہ ہوگا، "جس نے مدرسہ کا دروازہ کھولا، اس نے جیل خانہ کا دروازہ بند کر دیا! واقعہ یہ ہے کہ جیل کا دروازہ بند کر دیا! واقعہ یہ ہے کہ جیل کا دروازہ تعلیم ہی بند کر سکتی ہے۔ فرد اور سماج کی وہی اصلاح کر سکتی ہے، قوموں کی بڑائی کا یہی راز ہے۔ افلاطون کا قول ہے "تعلیم وہ بہترین چیز ہے۔ جس کا کوئی اچھا آدمی مالک ہوتا ہے" مونٹین کا قول ہے۔ جہل تمام رذائل کا سرچشمہ ہے!" فلر کا قول ہے۔ تعلیم سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ جہل کی زندگی موت کی زندگی ہے۔ انسان علم کا محتاج ہے، کیونکہ علم ہی زندگی کا بہترین وسیلہ ہے!

(۳۰)

حسن معاملت اور مساوات

اپنے بچوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ ان کے معاملات میں پورے عدل سے کام لو۔ محبّت اور شفقت کا حصّہ سب کو برابر دو۔ چھوٹے اور بڑے کی تمیز ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ اکثر علمائے نفس کا خیال ہے کہ "اگر بچّہ اور باپ کے ارادہ میں ٹکر ہو، تو باپ کے لیے مناسب یہ ہے۔ کہ یا تو چشم پوشی سے کام لے، یا وہ کام ترک کر دے۔" ذیل میں ہم ایک حکایت بیان کرتے ہیں، جس سے بچّہ کے شعور اور والدین کی طرف سے احتیاط و دور اندیشی کے مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک مثال علم النفس کے ایک مشہور عالم کا ایک بچہ تھا۔ عمر کوئی تین سال کے قریب، بڑا پیارا بچہ

تھا۔ اور بڑی اچھی عادتوں والا۔ ایک رات اس نے اپنی عادت کے بالکل برخلاف، رات کو سونے سے پہلے حمام میں جانے سے انکار کر دیا۔ ماں نے خیال کیا تھکا ہوا ہے۔ آلکسی کے مارے کپڑے نہیں اُتارنا چاہتا۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے اس کے کپڑے اُتارنے لگی۔ لیکن ماں نے دیکھا صاحب زادے بہت رنجور ہیں، دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے کپڑے پکڑے ہوئے ہیں، کسی طرح نہیں اُتارنے دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ بچّہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہے اور کسی طرح بھی کپڑے نہیں اتارنے دے گا۔ ماں نے ضد نہیں کی۔ بچّہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور کہا:۔

" اچھّا چلو بستر پر سو رہو۔ نہیں نہاتے نہ سہی۔ لیکن وہ پھر مچل گیا۔ میرے جو کپڑے تم اُتار چکی ہو، جب تک انھیں نہ پہن لوں، سونے بھی نہیں جاؤں گا، ماں نے کپڑے تم اُتار چکی ہو، جب تک انھیں نہ پہن لوں، سونے بھی نہیں جاؤں گا، ماں نے کپڑے پہنا دیے۔ کپڑے پہنتے ہی چہرہ کھل گیا اور مسرت کھیلنے لگی۔ نہ رونا، نہ غصّہ، ماں نے پوچھا، بیٹے! تم نے حمام کیوں نہیں کیا؟ فرمایا۔

" امی چلو، میں حمام کروں گا "! چنانچہ ماں کی انگلی

پکڑ کے حمام پہنچے، خوب ٹھاٹھ سے نہائے، اور پھر آکر بستر پر دراز ہو گئے۔

ماں اور باپ

ماں اور باپ دونوں کو بچہ کی اس روش پر سخت حیرت ہوئی۔ جب بچہ سو گیا۔ تو باپ کو یاد آیا، کل رات کو اس سے بڑے بچہ نے حمام جانے سے انکار کر دیا تھا، اور بغیر حمام کے سو گیا تھا، چھوٹے صاحبزادے نے سوچا میں کیوں نہ اپنی شخصیت کا مظاہرہ کروں، چنانچہ مچل گئے۔ بڑے بچے کو ماں نے اس لئے، گذشتہ رات کچھ نہیں کہا تھا کہ وہ سدا سے ہٹی تھا۔ یہ چھوٹا اور فرمانبردار تھا۔ لہذا ماں نے شروع میں اس پہ سختی کرنی چاہی۔ بچہ کو یہ فرق ناگوار ہوا، اور اس نے اپنی جان پر بنالی۔ وہ در اصل اس بات پر نہیں مچل رہا تھا کہ حمام نہیں جائے گا، بلکہ وہ اپنے حقوق کے لئے لڑ رہا تھا، اس کے اور اس کے بڑے بھائی کے ساتھ یکساں برتاؤ کیوں نہیں کیا جاتا؟

اکثر گھروں میں اس اصول کو مدِّ نظر نہیں رکھا جاتا۔ لیکن یہ بہت ضروری بات ہے کہ ایک بچہ کو جو آزادی ہو۔ وہی دوسرے کو بھی حاصل ہو۔ تاکہ کسی بچہ کے دل میں بھی یہ خیال پیدا نہ ہو۔ کہ اس کے ساتھ مساوات اور عدل کا

برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ اوپر کی مثال میں اگر ماں بچہ کی یہ واجبی ضد پوری نہ کرتی تو ہمیشہ اس کے دل میں یہ بات کھٹکتی رہتی کہ بڑے بھائی کے مقابلہ میں اس پر ظلم ہوتا ہے اور قیامت تک وہ حمام پر راضی نہ ہوتا۔ اس کا رنج اور صدمہ بڑھتا جاتا، چنانچہ سونے کے بعد بچہ حمام والا غصہ بھول بھی گیا. لیکن اگر زبردستی اسے نہلایا جاتا تو اس حادثہ کو وہ کبھی نہ بھولتا، انسان کی یہ سرشت ہے کہ وہ بہت سی چیزیں اور باتیں بھول جاتا ہے، لیکن اگر اس پر ظلم و زیادتی ہوئی تو وہ اسے کبھی نہیں بھولتا۔

بدسلوکی اور عدم مساوات

اور یہ بدسلوکی اور عدم مساوات کا احساس صرف بچوں ہی کو نہیں ہوتا، بلکہ پختہ عمر کے آدمیوں میں بھی ہوتا ہے۔ آپ اکثر لوگوں کی زبان سے سنتے ہوں گے، ہم تو بڑے اچھے معاملہ کے ہیں، لیکن دوسرے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ حسنِ معاملت کے جواب میں بدسلوکی کرتے ہیں۔

اُس دُنیا میں بچوں کو بڑی بڑی کٹھنائیاں سہنا پڑتی ہیں، ممکن نہیں کہ سوتیلی ماں کے زیر سایہ بچہ وہی صبر و طبیعت پا سکے جس کا اپنی مرحوم ماں کے زمانہ میں خوگر تھا۔ جو ظلم سوتیلی ماں بچہ پر کرتی ہے اُسے وہ کبھی نہیں بھولتا۔ ہمیشہ یاد رکھتا

ہے۔ کیونکہ اس کی سوتیلی ماں ہمیشہ اس کی شکایتیں کیا کرتی تھی۔ اُسے مارا پیٹا کرتی تھی، اُسے تکلیف دیتی تھی۔ وہ یہ سارے جور برداشت کرتا تھا، اور کوئی اس کی مدد کرنے والا نہیں تھا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سگی ماں بڑے بچہ کے مقابلہ میں چھوٹے بچہ کو زیادہ چاہنے لگتی ہے۔ اب بڑے بچّہ پر رنج کے دورے پڑتے ہیں، اور وہ اپنے تئیں مظلوم سمجھنے لگتا ہے، اور یہ ظلم اسے زندگی کے ہر دور میں یاد رہتا ہے۔ روسو کا قول ہے۔" میں جب کبھی ظلم یا مظلوم کا ذکر سنتا ہوں، بس بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ کیونکہ بچپن میں ایک بار مدرسہ میں مجھ پر ظلم کیا گیا تھا۔ مجھ پر ایک پیالہ توڑنے کا الزام لگایا تھا۔ جسے میں نے نہیں توڑا تھا اور ایک ایسے جرم کی شدید سزا مجھے دی گئی تھی، جو ہرگز مجھ سے سرزد نہیں ہوا تھا۔" دنیا میں ایسے ایسے مظلوموں کی تعداد کتنی زیادہ ہے۔

یکساں برتاؤ بہرحال والدین یا تربیت دہندہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے، ہر بچّہ اس کی نظر میں یکساں ہو، تربیت دہندہ میں ماں، باپ، بھائی، اُستاد مدرسہ سب ہی شامل ہیں۔ تربّیت دہندہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ

ناکردہ گناہ کی سزا نہ دے۔ نہ ایک آدمی کی سزا پوری جماعت کو دے۔ نہ کسی بچہ سے انتقام لے نہ کسی ایسے بچہ کو برا سمجھے جو کسی ایسے آدمی کا عزیز ہے جسے وہ پسند نہیں کرتا۔ اپنے ہر کام اور اقدام میں عدل و مساوات کو ہر وقت ملحوظ رکھے۔ کسی دوسرے کا گناہ ہو اور کوئی دوسرا پٹ جائے۔ ایسا بھی نہ ہونا چاہیئے۔

(۳۱)

بچوّں کی توجیہیں

بچوّں کی فطرت کا میلان کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں، اس کے اسباب و نتائج میں وہ خاص سے عام کی طرف جاتے ہیں، اس سے ان کی سرعت استنباط کا اندازہ ہوتا ہے، وہ سمجھتے ہیں تمام اشیا کا سبب واحد ہے، اور اعمال میں ایک ہی سا نتیجہ پیدا کرتے ہیں ایک تین برس کا بچہّ یہ کرسکتا ہے کہ وہ گرم پانی روٹی پر ڈال دے یہ سمجھ کر کہ روٹی پانی میں جذب ہوجائے گی، جیسے شکر دودھ میں گھل جاتی ہے۔ اس کا یہ فعل سرعت استنباط کا تو مظہر ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ غلط ہے اس کی فکر، اور اس کی توجیہہ و تعلیل سب غلط ہیں۔ اس کی غلطی یہ ہے کہ اس نے روٹی کو شکر کی طرح سمجھا، محض یہ دیکھ کر کہ شکر دودھ

یں گھل جاتی ہے۔ یہ نہ دیکھا کہ روٹی اور شکر، کتنی الگ الگ
اور جُدا جُدا چیزیں ہیں۔

تعلیل اور توجیہہ بچّے اکثر اپنی تعلیل اور توجیہہ میں چوک جاتے ہیں۔ ذراسی مشابہت دیکھ کر وہ
جلدی سے نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں، بچّہ ایسی تعلیل و توجیہہ کر سکے
گا جسے نتیجہ سے مطلق کوئی تعلق نہیں۔ کبھی ایک بچہ اپنی ماں سے
اس پر جھگڑ سکتا ہے کہ دودھ اس لئے سفید ہوتا ہے۔
کہ گائے سفید رنگ کی ہوتی ہے۔ اور دوسرے دن وہ یہ
رائے قائم کرے گا، دودھ ٹھنڈا ہے اور گائے بھی ٹھنڈی ہوگی۔ اس قسم کی
تعلیلیں اور توجیہیں مضحکہ خیز ضرور ہیں۔ لیکن ان سے یہ بھی اندازہ ہو سکے
گا کہ بچّہ کا ادراک اسباب کی تلاش میں کیسی کیسی جستجو کرتا ہے اب یہیں سے
تربیت دہندہ کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ کہ وہ ادراک کی اصلاح کرے
اور صحیح اسباب کی تلاش میں بچّہ کو لگا دے۔ اور اس کی غلطی اس پر ملائمت سے
واضح کردے۔

قوتِ توجیہہ کی تربیت بچّوں کی قوت توجیہہ و تعلیل کوئی مشکل کام نہیں ہے۔
اسے آسانی کے ساتھ انجام دیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ
قوتِ حکم کی بھی تربیت ہونی چاہیئے۔ یعنی بچّہ جو حکم لگائے وہ
غلط اور مہمل نہ ہو۔ بچّہ جن چیزوں میں گھرا ہوتا ہے۔ انھیں دیکھ دیکھ کر

طرح طرح کے سوالات کرتا ہے، ماں باپ جواب نہیں دیتے سوچتے ہیں صرف پریشان کرنے کے لئے، یہ سوال کر رہا ہے، حالانکہ یہ غلط ہے، بچہ کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ جستجو کرے اب اگر اسے صحیح اطلاع دی جائے، ٹھیک باتیں بتائی جائیں۔ تو نہ وہ حکم لگانے میں غلطی کرے گا، نہ اسباب غلط بتائے گا۔

بچوں کا مقصد کثرتِ سوال سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے آبا کو خواہ مخواہ پریشان کریں۔ وہ یہ سوالات اس لیے کرتے ہیں کہ انھیں فہم اور معرفت کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ جان لاک، مشہور انگریز ماہر تربیت کا قول ہے: "بچہ کا رجحان زیادہ سے زیادہ سوال کرنے کی طرف بڑھاؤ۔ جہاں تک ہو سکے اس کی رغبت کو ٹھیک کرو"۔

ہم معلمین اور آبا کو ہدایت کرتے ہیں، کہ وہ بچوں کو زیادہ پوچھ کچھ پر مائل کریں، اور ان کے سوالات کے سادے اور کافی جواب دیں۔ تاکہ بچے خود ہی صحیح بنیادوں پر اسباب تلاش کرنے لگیں۔ اور نتائج تک پہنچنے لگیں۔ اور حکم لگانے میں غلطی نہ کریں۔ ان کی توجیہہ و تعلیل بالکل ٹھیک ہو۔ پھر ان کی ذہانت و ذکاوت سست نہیں پڑے گی اور ہمیشہ وہ علم و معرفت کے اسباب کے لیے، دوسروں ہی کا منہ نہیں تکا کریں گے۔

بعض اوقات بچوں کے سوالات واقعی بے تکے ہوتے ہیں، اور ان کا جواب دینا درحقیقت بہت مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک بچہ پوری

سادگی سے پوچھ بیٹھے گا: "آسمان نیلا کیوں ہے؟ ـــــ "سمندر کا پانی نیلگوں کیوں ہے؟" ـــــ درخت ہلتے کیوں ہیں۔ اور ریل چلتی کیوں ہے؟ ـــــ" سوئچ دبانے سے بجلی کا بلب کیسے روشن ہو جاتا ہے؟" چاند کبھی چھوٹا اور کبھی بڑا کیوں ہوتا ہے؟" انسان پیدا کیسے ہوتا ہے؟" لیکن اِن بے تکے سوالوں کو بھی اس طرح جواب دیا جاسکتا ہے کہ بچہ کی حِس علم کو صدمہ نہ پہنچے اور اس کے علم میں کسی نہ کسی حد تک اضافہ ہو جائے۔

حکایت

ہم ایک حکایت بیان کریں گے۔" ایک دفعہ کوئی چار برس کی بچی نے اپنے فلسفیانہ سوالات سے ماں کو پریشان کر دیا، بچی نے روشن دان کے شیشے پر ایک شہد کی مکھی بیٹھی دیکھی۔ اس نے چاہا کہ مکھی کو پکڑ لے، ماں نے منع کیا "خبردار ڈنک مار دے گی!" بچی نے فوراً پوچھا ـــــ "امی! یہ شیشہ کیوں نہیں ڈنک مارتا۔ اُسے تو ہم روز چھوتے ہیں؟" ماں نے کہا: "اس لئے کہ شیشہ اعصاب نہیں رکھتا۔" بچی بھلا کیوں چُپ رہتی، پوچھنے لگی، اعصاب کیا؟ ننھے بچے بہت سی ایسی باتیں پوچھتے، جنہیں وہ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، کہ ان سوالات کی رَو میں انہیں کام کی باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔

جارج ایلیٹ مشہور انگریز خاتون لکھتی ہے:۔ اگر ہر بات کی دلیل

مہربان تم نے بچہ کو تباہ دی تو اسے ناکارہ کر دیا!" ان الفاظ سے اس کا مقصد یہ ہے کہ بہت سی دقیق اور نازک باتیں بچہ پوچھ بیٹھتا ہے۔ ان پر تقریر کرنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ ایسا جواب دیا جائے جو بچّہ کے ذہن اور عمر سے مناسبت رکھتا ہو۔

بچّہ اور آدمی میں فرق

غور و فکر ایک بہت بڑی نعمت ہے جو خدا نے اپنے بندوں کو عطا کی ہے جس طرح پختہ عمر کا آدمی سوچتا ہے۔ لیکن ان دونوں کی تفکیر میں فرق جو کچھ ہے وہ درجہ طریقہ اور ترتیب کا ہے۔ ایک اچھی عمر کے آدمی کی فکر منظم اور مرتب ہوگی۔ بچہ کی فکر سطحی، غیر مرتب اور غیر منطقی ہوگی۔ بچّہ تین برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اپنی فکر پسندی کی علامتیں ظاہر کرنے لگتا ہے۔ جب کھیلے گا تو بچّہ کچھ نہ کچھ سوال ضرور کرے گا کھیل کا ساتھی چلا جائے گا تو اس کے بارے میں سوالات اگر اس کا فنجان ٹوٹ جائے، یا بادل گرجے، یا کسی چڑیا پر نظر پڑے۔ تو ضرور کچھ نہ کچھ پوچھے گا۔ لیکن ان تمام سوالات کی نوعیت یہ ہوگی، گرگویا وہ علم و اطلاع حاصل کرنا چاہتا ہے۔

بچّہ کی ذکاوت اور ذہانت کا اندازہ اس کی باتوں اس کی تشبیہوں اور توجیہوں سے ہوتا ہے۔ اگر آپ بچوں کی باتوں پر کان دھریں تو بہت سے جواہر ریزے آپ کو ملیں گے۔

(۳۲)

عربوں کا اصولِ تربیت

ذیل میں عرب فلاسفہ و ادبا کے ہم وہ خیالات درج کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہو گا کہ عرب بچوں کی تعلیم تربیت اور تہذیب کا کیا اصول رکھتے تھے؟ ہم صرف واقعات درج کرتے ہیں فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں:۔

احنف اور معاویہ

احنف بن قیس ایک مرتبہ امیر معاویہ کے پاس آئے۔ یزید ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ باپ بیٹے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، معاویہ نے احنف سے پوچھا۔ "اے ابالبحر۔ بچوں کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟" احنف نے جواب دیا "اے امیر المومنین بچے، ہمارے ستون ہیں، جن سے ہماری پیٹھ سہارا لیتی ہے۔ وہ ہمارے دلوں

کے مرغوب پھل ہیں، وہ ہماری آنکھ کی ٹھنڈک ہیں۔ انہی کو لے کر ہم دشمنوں پر حملہ کرتے ہیں، وہی ہمارے بعد ہماری جگہ لیتے ہیں۔ بس تجھے چاہیئے کہ بچوں کے لیے نرم و ملائم زمین بن جا۔ ان کے لیے شفقت کا سایہ کرنے والا آسمان بن جا۔ اگر وہ تجھ سے مانگیں تو انہیں دے، وہ تیری رضا جوئی کے خواہاں ہیں تو ان سے خوش رہ، انہیں اپنی محبت سے محروم نہ رکھ، ورنہ وہ تیرے قرب سے بھڑکیں گے، تیری زندگی سے کھٹکیں گے اور تیری موت کی آرزو کریں گے"۔ معاویہ نے کہا "واہ ابا بحر، خوب گفتنی! واقعی لڑکوں کی وہی فطرت ہے جو تم نے بیان کی!"

امام غزالی، اپنی کتاب "احیاء العلوم" (جلد ۳ صفحہ ۱۵۲ بعنوان 'اخلاق کی تہذیب اور نفس کی ریاضت') میں مشورہ دیتے ہوئے کہ بچوں کے احوال و مزاج کے مطابق کیا کرنا چاہیئے۔ اور ان سے ان سے کس طرح پیش آنا چاہیئے اور ان کا مزاج کیونکر پہچاننا چاہیئے؟ لکھتے ہیں:-

"اگر ایک طبیب تمام بیماروں کا ایک ہی نسخہ لکھے، اور ایک ہی دوا سے علاج کرے، تو اکثر کی ہلاکت کا باعث ہوگا۔ بالکل یہی حال تربیت دہندہ کا ہے، اگر وہ اپنے زیر تربیت لڑکوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے گا تو انہیں ہلاک کر دے گا۔ اور ان کے قلوب پر موت

طاری کر دے گا، تربیت دہندہ کا فرض ہے کہ اپنے زیر تربیت لڑکوں میں سے ہر ایک کے حال، عمر اور مزاج کے مطابق ان کے لئے راستہ تجویز کرے۔ اور ان کے لئے وہی ریاضت تجویز کرے، جس کے وہ متحمل ہو سکیں"!

امام غزالی کا قول

بالکل یہی بات آج کل کے ماہرین علم النفس اور تربیت و تعلیم بھی رکھتے ہیں۔

امام غزالی اپنی مذکورہ کتاب میں آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"یاد رکھنا چاہیئے، صبیان کی تربیت سب سے اہم اور کٹھن معاملہ ہے۔ بچہ اپنے والدین کے پاس ایک امانت ہے۔ اگر اس کی صحیح تعلیم و تربیت ہو، تو اس کی نشو و نما بھی درست ہوگی۔ اور اگر غلط تربیت و تعلیم ہوئی تو وہ ناکارہ ہو جائے گا۔ بدبخت ثابت ہوگا اور ہلاک ہو جائے گا۔ اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہوا تو ضروری ہے کہ اسے سزا پوشیدہ طور پر دی جائے، اور اس سے کہا جائے۔ خبردار، اب ایسی حرکت نہ کرنا کبھی۔ ہر وقت بچہ کو ڈانٹنا ڈپٹنا بھی نہیں چاہیئے پھر وہ ملامت کا خوگر ہو جاتا ہے، اور بڑی حرکتوں کے صدور پر جری ہو جاتا ہے۔ اور بات کا ذرا بھی اثر نہیں

لینا۔ باپ کو چاہیئے، کہ وہ بچہ کی نگہداشت سے کسی وقت غافل نہ ہو۔ اس پر اپنا رعب رکھے۔ ڈانٹ ڈپٹ کرے۔ لیکن کم (یہ بھی ضروری ہے کہ، اسے ورزش اور کھیلنے کا عادی بنائے۔ تاکہ وہ چُست رہے۔ اور اس پر کسل وماندگی غالب نہ آنے پائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جب وہ تعلیم گاہ سے واپس آئے تو اسے کھیلنے کا موقع دے، تاکہ وہ راحت پائے اور مکتب کی ذہنی تھکن دُور ہو جائے لیکن کھیل ایسا نہ ہو جو بہت زیادہ تھکا دے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اسے ماں باپ کی اطاعت، معلّم اور مؤدّب کی اطاعت کا عادی بنایا جائے، اور ہر اس شخص کا احترام کرنا سکھایا جائے، جو اس سے عمر میں بڑا ہو یا اجنبی ہو!"

یہ وہ بہترین اصول ہیں، جن کی پیروی، آج یورپ اور امریکہ کر رہے ہیں، اور نئے زمانہ کے علمائے تربیت وعلم النفس، انہی اصولوں کو اپنائے ہوئے ہیں

بچّہ اور خیر وشر

امام غزالی کی رائے میں بچّہ جب پیدا ہوتا ہے، تو اس میں خیر و شر کی یکساں صلاحیت ہوتی ہے، اور والدین اسے دونوں میں سے ایک کی طرف مائل

کر دیتے ہیں، رسول اللہ کا ارشاد ہے: ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ یہی بات تعلیم و تربیت کے بارے میں بھی ہے۔

ابن خلدون نے اپنے مشہور مقدمہ میں (صفحہ ۶۱۹) ایک مستقل باب باندھا ہے۔ "بچوں پر سختی مضر ہوتی ہے!" اس باب میں وہ تحریر فرماتے ہیں:-

" دوران تعلیم میں متعلّم کی مار پیٹ نامناسب ہے، خاص طور پر چھوٹی عمر کے بچوں پر تو بالکل سختی نہیں کرنی چاہیئے، جو شخص بچوں یا غلاموں یا خادموں سے قہر کا برتاؤ کرتا ہے۔ وہ ان کے دل کی خوشی چھین لیتا ہے۔ انھیں نکمّا بنا دیتا ہے۔ انھیں دروغ گو اور بدباطن کر دیتا ہے۔ وہ ایسی باتیں ظاہر کرنے لگتے ہیں، جو ان کے ضمیر کے خلاف ہوتی ہیں۔ ایسا نہ کریں تو قہر کے شکار بنیں۔ وہ مکر اور دھوکے کے عادی ہو جاتے ہیں، کہ بغیر اس کے کام نہیں چل سکتا۔ پھر یہی اطوار، ان کی عادت اور خلق بن جاتے ہیں۔ پس معلّم کو چاہیئے کہ وہ اپنے شاگرد پر، باپ اپنے بیٹے پر قہر و استبداد کا مظاہرہ نہ کریں، اور ان کی تربیت جور و ستم کے بل پر نہ کریں!"

ہارون رشید کا واقعہ خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے بیٹے امین کے معلم سے اسے اس کی تربیت میں دیتے ہوئے کہا تھا:-

" اے احمر! خلیفہ وقت نے تجھے اپنی سب سے قیمتی پونجی ، اپنے دل کے چین و آرام کو تجھے سونپا ہے۔ لہذا اپنی شفقت کا ہاتھ اس پر دراز رکھ، اسے قرآن پڑھا، تاریخ کے واقعات سُنا۔ اشعار یاد کر سنت نبویؐ سے آشنا کر، اس میں بصیرت پیدا کر تاکہ وہ اچھے کام کو پرکھ سکے، اسے ہنسنے سے سوائے خاص اوقات کے منع کر، اسے تعلیم دے کہ جب بنو ہاشم اس کے پاس آئیں، تو ان کا احترام کرے، اس کے ساتھ کوئی بھی ایسی ساعت نہ گزار، جو اس کے لئے سود مند نہ ہو۔ لیکن اسے رنجیدہ نہ کر کہ اس کا ذہن مر جائے۔ اس کی غلطیوں کو نظر انداز نہ کر، ورنہ وہ ان کا عادی ہو جائے گا۔ نرمی اور ملاطفت سے اسے راہ راست پر لا، اگر وہ تیرا کہا نہ مانے تو سختی کر۔"

طوالت کے اندیشہ سے ہم صرف انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ ادب عربی اس قسم کے واقعات و امثلہ

سے بھرا پڑا ہے۔ جو کچھ ہم نے اوپر کی سطروں میں پیش کیا ہے، وہ کافی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس طرح کی مثالیں زیادہ معلوم کرے اُسے چاہیے کہ آغانی۔ امالی، کامل؛ عقد الفرید؛ زہر الآداب؛ صبح الاعشیٰ، البیان؛ والتبیین، مقدمہ ابن خلدون؛ اور امام غزالی کی، احیاء العلوم کا مطالعہ کرے۔

(۳۳)

بچپن اور جوانی کے مراحل

یہ تو معلوم کر چکے، کہ بچّہ اور آدمی میں فرق ہے، اب ہم ان مراحل کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جو بچپن سے آغاز شباب تک درپیش آتے ہیں۔ اس باب میں دوسرے علمائے نفس و تربیت کے علاوہ ہم نے پروفیسر کلاپاریڈ کی کتاب "نفسیات طفلی" کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے۔

نفسیاتِ طفلی

وہ مراحل یہ ہیں

	لڑکے	لڑکیاں
۱ ۔ پہلا مرحلہ، بچپن،	سات برس تک	چھ سے سات برس تک
۲ ۔ دوسرا مرحلہ، بچپن:	سات سے ۱۲ سال تک	۷ سے ۱۲ سال تک
۳ ۔ تیسرا مرحلہ، آغاز شباب:	۱۲ سے ۱۵، ،	۱۰ سے ۱۳ ،

۴۔ چوتھا مرحلہ، جوانی :- ۱۵ سے ۱۶ سال تک ۱۳ سے ۱۴ سال تک

یہ تمام مراحل جسمی، عقلی اور خلقی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، اور ہم ان پر الگ الگ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

پہلا مرحلہ

پہلے مرحلہ کے دوران میں بچہ نمایاں طور پر نشوونما حاصل کر لیتا ہے۔ یہ نشوونما پہلے اور دوسرے، پھر چھٹے اور ساتویں سال میں زیادہ واضح ہوتا ہے۔ ولادت کے پہلے مہینوں میں بچہ ہاتھ پاؤں مارنا اچھی طرح سیکھ لیتا ہے۔ چھٹے مہینے اس میں بیٹھنے کی سکت آجاتی ہے۔ دسویں مہینے کے بعد وہ گھسٹنے لگتا ہے۔ اور سال بھر کے بعد کچھ کچھ چل لیتا ہے۔ ولادت کے دوسرے یا تیسرے روز وہ دیکھنے لگ جاتا ہے۔ ساتویں مہینے سے پہلے وہ ماں اور آیا، باپ اور چچا میں تمیز نہیں کر سکتا۔ پہلے سال میں اُسے گوناگوں امراض کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جیسے دست، معدہ کی خرابی ہڈیوں کی تری، چیچک، کھانسی وغیرہ کا زور بالعموم پانچویں چھٹے سال میں ہوتا ہے۔

تین برس کی عمر تک بچہ کے ادراکات بالکل سطحی ہوتے ہیں مثلاً پہلے سال میں وہ کبوتر اور فاختہ میں مرغ یا مرغی میں فرق نہیں کر سکتا۔ وہ اس پہلے مرحلہ میں صرف انہی چیزوں کا ادراک کر سکتا ہے جو محسوس ہوں، لہذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ مدارس ابتدائیہ میں بچوں کو ہم جو درس دیں، وہ ایسی چیزوں پر مبنی ہو، جو دیکھی جا سکیں۔

چھوٹی جا سکیں، سنی جا سکیں جہاں تک ممکن ہو سکے نمونوں اور تصویروں سے وضاحت کر کے ہم سمجھائیں ۔ تجربہ کی کمی ، اور عقل کی خامی کے باعث اس مرحلہ میں بچّہ کی فکر مربوط نہیں ہوتی ۔

طفولیّت کے پہلے دَور میں بچّہ کا آغازِ کار کھیل سے ہوتا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز آجائے گی تو خوشی خوشی اسے اپنی مٹھیوں میں بھینچ لے گا ۔ پھر پھینک دے گا ، تیسرے سال وہ اس قابل ہو جاتا ہے ، کہ وہ دوسروں کی نقل اتار سکے وہ اپنے چوبی گھوڑے یا گاڑی پر چڑھے گا ۔ کھیلوں میں زیادہ مشغول رہے گا ۔ خرید و فروخت سے دلچسپی لے گا اور بچپن کے کھیلوں سے بہت زیادہ دلچسپی کا اظہار کرے گا ۔ اور اس سوسائٹی سے پوری طرح متاثر ہو گا ، جو اس کے گھر سے عبارت ہے ۔ بچّہ جب تک تین سال کا ہو جائے ، تجارب اور حوادث کو یاد نہیں رکھ پاتا ، بھول جاتا ہے

بچّہ کی رونے کی عادت ہے ۔ لیکن کسی حد تک ماں باپ کو اس کے رونے پر کان دھرنا چاہیئے ؛ وہ ایسا کھانا مانگتا ہے جو اس کے لئے مناسب نہیں ہوتا ۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اس کی یہ ضد پوری کر دی جائے ؟ وہ بچّوں کا کھیل چھیننا چاہتا ہے ۔ یا دھار دار چیزوں سے ۔ مثلاً چھری یا سوئی سے کھیلنا چاہتا ہے ، یا ایسی چیزوں سے کھیلنا چاہتا ہے ، جو بڑی آسانی سے ٹوٹ سکتی ہیں جیسے گلاس اور پیالہ ، یا وہ ایسے کھیل کھیلنا چاہتا ہے ۔ جو مضر ہیں ، جیسے کتاوں اور

کاپیوں کا پھاڑنا۔ ایسے مرحلوں پر سمجھ دار تربیت دہندہ کا فرض ہے کہ وہ دانش مندی اور حکمت عملی سے کام لے۔ نہ ہر کام کی کھلی چھٹی دے دے، نہ ہر کام سے منع کر دے، اس کا فیصلہ ترازو کے دو پلڑوں کی طرح برابر ہونا چاہیئے۔ بے ضرر کھیل کی اجازت، اور نامناسب کام کی ممانعت!

اس موقع پر ہم ایک بات اور بھی کہنا چاہتے ہیں۔ بچوں کے لیئے یہ قطعاً ناممکن ہے کہ وہ اپنے کپڑے میلے نہ ہونے دیں۔ کبھی کسی سے جھگڑا نہ کریں۔ کبھی توڑ پھوڑ نہ کریں، یا کوئی چیز ضائع نہ کریں، انھیں کبھی چوٹ نہ لگے یا وہ زخمی نہ ہوں۔ یہ سب باتیں ان سے سرزد ہوں گی اور ضرور ہوں گی۔ لیکن ان کا علاج مار پیٹ، ڈانٹ ڈپٹ یا جبر و قہر نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ حکمت عملی سے انھیں اچھائی پر آمادہ کیا جائے۔ اور برائی سے روکا جائے۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ مار بالکل آخری دوا ہے۔

بچہ کا غصہ

اس دور میں بچہ اپنا مطالبہ پورا کرانے کے لیئے روتا ہے۔ اگر اس کی بات پوری کرنے میں دیر کی جائے تو اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کی بات پوری کر دی جائے تو بہت خوش ہوتا ہے اس کی بات پوری کرنے میں اگر دیر کی جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ وہ اور کچھ نہیں جانتا، صرف یہ جانتا ہے کہ میں نے

مانگا اور وہ نہیں ملا جو میں نے چاہا!" بس اب وہ رونے لگے گا۔ اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے گا کہ اس کی ماں اسے چاہتی نہیں، اسی لئے اس کا مطالبہ پورا نہیں کرتی۔ ایک جاہل ماں بچّہ کے رونے کا مطلب صرف یہ سمجھتی ہے کہ وہ بھوکا ہے اور کھانا مانگ رہا ہے۔ حالانکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچّہ بالکل بھوکا نہیں ہوتا۔ کھانے کا اسے خیال بھی نہیں ہوتا۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے بدل دیئے جائیں۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بچّے اکثر تنگ کپڑے پہنتے ہیں۔ انھیں کس کے باندھ دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کے بس میں نہیں رہتا کہ ہاتھ پاؤں ہلا سکیں یا آسانی سے سانس لے سکیں۔ اسی طرح وہ زیادہ تر کھلی ہوا، اور دھوپ سے بھی محروم رکھے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس انگلستان میں بچّہ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ خوب لمبے سانس لے ہلے ڈلے۔ اس کے کپڑے بڑے فراخ بنائے جاتے ہیں۔ اسے باغوں میں لے جایا جاتا ہے۔ ایسے کمرے میں سلایا جاتا ہے جس کے روشن دان کھلے ہوں۔ موسم سرما میں کبھی کبھی اُسے کھلی دھوپ میں بالکل ننگا ڈال دیا جاتا ہے۔ تاکہ دھوپ میں بالکل ننگا ڈال دیا جاتا ہے، تاکہ دھوپ اور ہوا کھائے۔ اسے ایسے کھانے دیئے جاتے ہیں جو اس کی صحت کے لئے مفید ہوں۔ اسے توانا بنائیں، دن رات میں چار بار، مقررہ اوقات میں کھانا دیا جاتا ہے۔

وہاں بچہ کو صرف ماں کی محبت پر نہیں چھوڑ دیا جاتا، بلکہ ان کی حرکات وسکنات کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کی اموات کی شرح بہت کم ہے۔

مشاہدات اور تجارب ضروری ہے کہ ہم بچوں کی تربیت و تعلیم کے سلسلہ میں پرانی روایات کے بندھنوں کو توڑ دیں۔ مشاہدات اور تجارب نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ یہ روایات مضر ہیں۔ ان سے فائدہ نہیں پہنچتا۔ نقصان شدید پہنچ جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ بچوں کی تربیت و تعلیم میں، کھلانے پلانے میں، پہنانے اوڑھانے میں، ان علمی اصولوں سے پورا فائدہ اٹھایا جائے جو ترقی یافتہ ممالک میں رائج ہیں۔ دھوپ، ہوا، اور روشنی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ امراض سے بچنے اور محفوظ رہنے کے طریقوں پر سختی سے عمل کیا جائے۔ پرہیز، علاج سے بہتر ہے، یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے۔

بچہ خیالی قصوں اور کہانیوں کا شائق رہتا ہے۔ بعض علمائے تربیت کا خیال ہے۔ بچہ کو ان کا عادی نہ بنانا چاہیئے۔ بلکہ عالم حقیقی کی کہانیاں سنانی چاہئیں۔ تاکہ بچہ خیالی دنیا میں نہ رہے، عملی دنیا کو دیکھے اور سمجھے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بچوں کو عالم خیال کی دلچسپیاں بھی خاصا فائدہ پہنچاتی ہیں۔

بچہ اپنے آپ کو بہت چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے اپنے چھوٹے

بھائی کے کھیل چھین لے ، ماں باپ صرف اسی کو چاہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کا خیال ہی نہیں کرتا ۔ تربیت دہندوں کو چاہیئے کہ بچوں کے ساتھ کامل عدل اور مساوات کا برتاؤ کریں ۔

دوسرا مرحلہ دوسرا مرحلہ بچہ کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ پڑھنا لکھنا سیکھے ۔ تھوڑا بہت حساب بھی وہ سیکھ لیتا ہے بہت سی باتیں اقوال اور آیتیں وہ زبانی یاد کر لینے کی صلاحیت بھی پیدا کر لیتا ہے ۔ اشعار ، قومی نظمیں بھی کچھ کچھ یاد ہو جاتی ہیں ۔ اب اس کا حافظہ استحکام حاصل کرنے لگتا ہے ۔ وہ بیک وقت دو زبانیں سیکھ سکتا ہے ۔

اب بچہ میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی فکر کو کسی درجہ میں منظم کر لے ، وہ واقعات کے اسباب وعلل کی چھان بین کرنے لگتا ہے ، لیکن اس مرحلہ پر بچہ کے ذہن و دماغ پر اتنا بوجھ نہ ڈال دینا چاہیئے کہ وہ سہہ نہ سکے ۔

کھیل کود میں بچہ سیر وشکار کی طرف مائل ہو جاتا ہے ۔ مچھلی کے شکار سے بھی اُسے رغبت ہوتی ہے ۔ گیند کھیلنے ، اور دوڑنے سے بھی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اب ایسا سخت کاموں کی طرف راغب ہو جاتا ہے ، اور لڑکی سینے پرونے سے دلچسپی لینے لگتی ہے

اس مرحلہ میں ، بچوں کو مبادی زبان کی تعلیم دی جا سکتی ہے ۔ کہ وہ آسان زبان میں لکھ سکے ، پڑھ سکے ، بات چیت کر سکے ۔

مبادی حساب و جغرافیہ و تاریخ کی بھی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ نقّاشی اور ہاتھ سے کرنے والے کاموں پر بھی مائل کیا جاسکتا ہے۔

اس مرحلہ میں جسمی امراض، پہلے مرحلہ کے مقابلہ میں کم حملہ آور ہوتے ہیں اور اگر ورزش، بوائے اسکاوٹ، اکسکرشن وغیرہ کا سلسلہ جاری رہے تو بدن بہت زیادہ مضبوط اور توانا ہو جاتا ہے۔

تیسرا مرحلہ عنفوانِ شباب کے مرحلہ میں بچّے ابتدائی مدارس کا کورس پورا کر کے، ثانوی مدارس کا رُخ کرتے ہیں اس دَور میں ان کے اجسام تیزی کے ساتھ بڑھنے لگتے ہیں، جنسی خواہش بھی پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس دَور میں بچوں کا نمو مختلف ہوتا ہے۔ بچے اپنے آبا و اجداد سے کشیدہ قامتی یا پستہ قدی ورثہ میں پاتے ہیں۔ اس دَور میں ان کے اعضاء اور حرکات و سکنات میں ایک اضطراب سا پایا جاتا ہے۔ یہ اضطراب نتیجہ ہوتا ہے۔ اضطراب اعصاب کا۔ اس دَور میں ذکاوت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ خیال آفرینی بڑھ جاتی ہے۔ اُمنگیں مچلنے لگتی ہیں، بڑے لوگوں اور فن کاروں کی طرف رغبت بڑھ جاتی ہے۔ اس دَور میں لڑکا پڑھنے لکھنے کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے۔ بشرطیکہ تربیت دہندہ طریقہ اور سلیقہ سے کام لے وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگتا ہے۔ ایسی شخصیت جس کا ارادہ پورا ہی ہونا چاہیئے۔ جس کی عزّت ہونی ہی چاہیئے

چوتھا مرحلہ یہ جوانی کا مرحلہ ہے ! ـــــــ اس مرحلۂ شباب میں خاص توجہ کی ضرورت ہے ۔ اس مرحلہ پر باپ کا فرض ہے کہ وہ بیٹے کی ، اور ماں کا فرض ہے کہ وہ بیٹی کی بہت صحیح رہنمائی کرے ۔ نوجوان لڑکے یا لڑکی کو کثرت سے وہ صحیح اور مستند کتابیں پڑھنے کے لئے دینی چاہئیں جن سے وہ صحیح فائدہ اُٹھا سکے ، گمراہی سے بچ سکے ۔ جوان مردوں اور عورتوں کا یہ دَورِ حیات بہت خطرناک ہوتا ہے ، اس زمانے میں لڑکے ، اور لڑکی کو ایسے کاموں میں منہمک رکھنا چاہیئے ۔ جوائے بھٹکنے نہ دیں ، لڑکے کو ہاکی ، فٹ بال ، تیراکی ، کشتی اور دوسری ورزشوں نیز مطالعہ کتب اور تحریر و تقریر کی طرف متوجہ رکھنا چاہیئے ۔ اور لڑکی کو موسیقی ، نقاشی ، تصویر کشی ۔ مطالعہ کتب اور دوسرے اچھے کاموں میں لگا رکھنا چاہیئے تاکہ اس کا وقت صحیح طور پر کٹ سکے ۔ اور وہ غلط راستے پر نہ جا سکے ۔

مبرزات وجدانیہ و عقلیہ قدیم علماء کا خیال تھا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ملکاتِ عقلیہ عطا فرمائے ہیں ۔ اور یہ ملکات مراحل نمو میں سے ہر مرحلہ پر نمایاں ہوتے رہتے ہیں ، اور یہ کہ ان ملکات کا ایک مستقل مرکز دماغ کے اندر موجود ہے ۔

لیکن جدید علم النفس نے ملکات کے اس نظریہ کو باطل

کر دیا ہے۔ اور یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ عقلی نمو کے لئے انسان مجبورِ عمل " ہے۔ ذیل میں ہم مراحل بلوغ میں سے چند کا تذکرہ کرتے ہیں :۔

۱ ۔ اس مرحلہ میں اکثر طلبہ رٹنے پر سمجھنے کو ترجیح دیتے ہیں شعر اور خیالی باتوں پر زیادہ متوجہ ہوتے ہیں مضمون لکھنے اور شعر کہنے کی صلاحیت بھی ان میں پیدا ہو جاتی ہے

۲ ۔ اجتماعی رُوح بیدار ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے ساتھ تعاون کرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اندھی تقلید سے طبیعت نفور ہو جاتی ہے اور حکم داری کا شوق پیدا ہونے لگتا ہے۔

۳ ۔ زندگی سے سبق حاصل کرنے ، اور تجارب سے فائدہ اُٹھانے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

۴ ۔ اس مرحلہ میں ایک خاص قسم کا چونچال پن پیدا ہو جاتا ہے۔

۵ ۔ اطاعت سے طبیعت بھاگتی ہے۔ حکومت کا شوق پیدا ہوتا ہے

۶ ۔ مختلف قسم کی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ کبھی شرم وحیا غالب ہوتی ہے۔ کبھی شجاعت و تہور کا غلبہ ہوتا ہے۔ کبھی بزدلی کارفرما ہوتی ہے۔

۷ ۔ اضطراب وجدان کی وجہ سے اضطراب فکر بھی پیدا ہو جاتا ہے رجحانات مختلف ہو جاتے ہیں گھر میں کچھ اور جی چاہتا ہے۔ مدرسہ میں کچھ اور کیفیت ہوتی ہے۔

۸ ۔ علوم طبعی ، تصویر کشی ، نقاشی ، موسیقی ، شعر ، فلسفہ ، مذہب سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ نفس کو راہ راست پر لانے کا بہترین زمانہ ہے۔ بڑے لوگوں کے قدم بہ قدم چلنے اور ان جیسا بننے کی تمنا سر اُٹھاتی ہے۔

(۳۴)

بچّوں کی انفرادیت

تعلیمی معاملات میں اختلافِ فرو عیت کا لحاظ

جدید علم النفس ایک عرصہ کے تجارب اور بحث و گفتگو کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ہر انسان کی عقل یکساں نہیں ہوتی۔ بہت سے عقلی امتحانات سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ ایک ہی عمر کے بچوں کی عقل میں تفاوت ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ایک ہی قوم اور جنس سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہیں، خواہ ان کا خاندان بھی ایک کیوں نہ ہو۔ یہ عقلی تفاوت دو سگے بھائیوں تک میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ اختلاف تکوین عقلی اور ذکائے طبعی ہی میں نہیں ہوتا۔ بلکہ رغبت اور رحجان میں بھی ہوتا ہے۔ جس طرح ادراک، تخیل، تصور اور یادداشت میں اختلاف ہوتا ہے اسی طرح طریقِ فکر اور قوتِ جسمیہ و عقلیہ میں بھی ہوتا ہے۔

بچہ اور سبق ہر مدرس کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیئے، کہ کوئی سبق بھی تمام طلبہ کے لیئے یکساں مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لیئے کہ ان کی عقلی قوت یکساں نہیں ہے۔ علمائے نفس کا خیال ہے کہ معلم کو درس دیتے وقت اس فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنے عمل میں کامیاب ہو۔ اس کا فرض ہے۔ کہ تلمیذ کو اتنا ہی بتائے اور سکھائے، جو اس کی ذہنی و عقلی استعداد کے مطابق ہو۔ مدرس کی کامیابی یا ناکامی صرف اسی بات پر منحصر ہے۔ اور مدرس، مدرس کہلانے کا مستحق نہیں جو بچوں کی طینت اور جبلت سے آشنا نہ ہو۔ افراد کے درمیان اوصاف خلقی کا بہت شدید اختلاف ہے اور اس اختلاف کو کسی وقت بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ ہر فرد ایک ایسی انفرادیت رکھتا ہے، جو اسے دوسروں سے ممتاز کر دیتی ہے۔ ہر دس لاکھ کی تعداد میں دو آدمی بھی مشکل سے ایسے ملیں گے۔ جن کی عقلی، ذہنی اور جسمانی صلاحیت و قوت بالکل یکساں ہو۔ لہذا ثابت ہوا۔ افراد کے درمیان قوت عقل و فہم کا زبردست اختلاف ہے۔ افراد کا اختلاف زیادہ نمایاں ان تین صورتوں میں ہوا کرتا ہے۔

۱ - اخلاق۔
۲ - قوت عقلی

۳ . میل و رغبت ۔

مختلف بچّے چنانچہ اکثر یہ بات مشاہدہ میں آتی رہتی ہے "
کہ ایک بچّہ ایک کتاب تین مہینہ میں ختم کر لیتا ہے ۔ اور دوسرا بچہ اسی کتاب کے ختم کرنے میں پورا سال لگا دیتا ہے ۔ امریکہ کے بعض مدارس نے اس بات کی تحقیق کے بعد اندازہ لگایا ۔ کہ ذہین طالب علم جو کام دو دن میں کر سکتا ہے ۔ وہی کام ایک کند ذہن طالب علم سو دن میں بھی نہیں کر سکتا ۔ چنانچہ تورندیک کا قول ہے : ہم نے ایسے بچے بھی دیکھے جن کی عمر چھ سال ہے ۔ اور وہ ایسے عقلی کام کر لیتے ہیں جو دس برس کے بچے بھی نہیں کر سکتے ۔"

یہ ذوق مدرسہ کی زندگی کا نتیجہ نہیں ہوتے ، بلکہ خارجی موثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ مثلاً گھر ، سوسائٹی اور وراثت !

ایک علامہ کی تحقیق و تفتیش کے بعد علمائے علم النفس اس فیصلہ پر پہنچے ہیں کہ خوش مزاجی ، بد خلقی ، ہجا کی قدرت ، موسیقی سے رغبت ، دو ٹوک فیصلہ کرنے کی اہلیت ، عہد کی پابندی ، مسرت و غم ، یہ تمام باتیں زیادہ تر موروثی ہوتی ہیں ۔ ان چیزوں کی تعمیر میں گھر کا بہت بڑا حصّہ ہوتا ہے ۔ اسی طرح ضعف عقلی ، کند ذہنی ، بدیہہ گوئی ، قوت حافظہ کی مضبوطی یا کمزوری ، ذہانت اور اس طرح کے دوسرے صفات عقلیہ بھی زیادہ تر موروثی ہوتے ہیں ، ان کی تعمیر میں بھی گھر

بڑا حصّہ ہے۔

مدرّس اور معلمین ایک بہت بڑی غلطی یہ بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذہین اور کند ذہن طلبہ میں امتیازِ درس ملحوظ نہیں رکھتے، حالانکہ بہت ضروری ہے کہ پڑھاتے وقت ان فروق کو پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔ اور بچّہ کو وہی دیا جائے جسے وہ لے سکے، اور بآسانی ہضم کر سکے۔

---

(۳۵)

بچّہ کا عقلی امتحان

فرانس کے مشہور عالم الفریڈ بینیٹ نے اپنی کتاب "بچوں کے بارے میں جدید آرا" میں بچوں کے عقلی امتحان کا ایک چارٹ درج کیا ہے۔ تھوڑے سے تصرف کے ساتھ ہم اس کے بعض حصص درج کرتے ہیں۔

بچّہ کی عمر	امتحان
۳ ماہ؛	جو سامنے آئے اسے دیکھنا
۹ ماہ۔	(۱) جو آواز کان میں آئے اس کی طرف توجہ
	(۲) کسی چیز کو دیکھ کر اسے پکڑنا یا اس کیطرف ہاتھ بڑھانا۔
پہلا سال؛	کھانے کی مختلف قسموں میں تمیز کرنا۔

بچہ کی عمر	امتحان
دو سال:	(۱) چلنا سیکھ لے۔
	(۲) جن چیزوں کی ضرورت ہو انھیں بیان کر سکے
	(۳) جو کچھ کہو سمجھ لے۔
تین سال:	(۱) اپنی ناک، آنکھ اور منہ کو پہچان سکے۔
	(۲) اپنا نام اور لقب سمجھ سکے
	(۳) سماعت کے بعد چھوٹے چھوٹے جملے دہرا سکے۔
	(۴) ہم شبیہہ صورتوں کو دیکھ سکے۔
چار سال	(۱) اپنی جنس یعنی مذکر، مونث پہچان سکے۔
	(۲) مندرجہ ذیل اشیا کے نام یاد رکھ سکے۔ مثلاً کنجی، چھری، پیسہ، یہ نام پوچھنے پر بتا سکے۔
	(۳) تین عدد تک کے ہندسے سن کر یاد کر سکے
	(۴) دو خطوں میں امتیاز کر سکے کہ ان میں کون بڑا اور کون چھوٹا ہے۔
پانچ سال:	(۱) دو مختلف وزن کے صندوقوں کا اندازہ کر کے بتا سکے، ہلکا کون ہے بھاری کون؟
	(۲) مربع کی شکل سامنے رکھ کر نقل کر سکے۔
	(۳) دس ٹکڑوں تک کا جملہ سن کر دوہرا سکے۔

بچہ کی عمر | **امتحان**

(۴) چار پیسے اس کے سامنے رکھ دیے جائیں تو ایک ایک کر کے گن سکے۔

(۵) آسان کھیل کھیل سکے۔ چھوٹے چھوٹے تکونی کام کر سکے۔ پھر انھیں توڑ دے۔ یا پھینک دے، اور دو بارہ ویسے ہی بنانے پر نہ دوڑے۔

چھ سال:

(۱) داہنے اور بائیں ہاتھ کی تمیز کر سکے۔

(۲) سولہ ٹکڑوں تک کا جملہ سن کر دوہرا سکے۔

(۳) دو مختلف صورتوں کو یاد رکھ سکے۔ اور یہ یاد رکھ سکے ان میں خوبصورت کون تھا؟

(۴) ہر وقت کے برتنے کی بعض چیزوں کی تعریف کر سکے۔

(۵) جو کام بتایا جائے اُسے کر سکے۔

(۶) اپنی عمر بتا سکے۔

(۷) صبح و شام کی تمیز کر سکے۔

(۱) جو صورت دکھائی جائے اس کے نقائص کی طرف اشارہ کر سکے۔

سات سال:

(۱) جو صورت دکھائی جائے اس کے نقائص کی طرف اشارہ کر سکے۔

بچّہ کی عمر — امتحان

(۲) متوازی اضلاع کی شکل، نقل کر سکے۔
(۳) لکھی ہوئی عبارت کاٹ سکے۔
(۴) پانچ حسابی ہندسے سن کر دوہرا سکے۔
(۵) جو صورتیں سامنے ہوں، ان کا وصف بیان کر سکے۔
(۶) سِکوں کی قیمت پہچان سکے۔
(۷) نقود میں سے چار مختلف انواع کو یاد رکھ سکے

آٹھ سال۔ (۱) کوئی تحریر پڑھے، تو اس کے کچھ ٹکڑے یاد رکھ سکے۔
(۲) چار رنگوں کے نام یاد رکھ سکے
(۳) حافظہ سے کام لے کر دو چیزوں کے وزن کا اندازہ کر سکے۔
(۴) بیس سے ایک تک اُلٹی گنتی گن سکے
(۵) جو املا بولا جائے اسے لکھ سکے۔
(۶) چار پیسوں کے مجموعہ (اکنی) کو سمجھ سکے۔

نو سال۔ (۱) آج کی تاریخ یاد رکھ سکے۔
(۲) ہفتے کے دنوں کے نام یاد رکھ سکے، پوچھا جائے، آج کون دن ہے؟ تو نام بتا سکے۔

بچہ کی عمر	امتحان
	(۳) لکھ سکے، اور یاد رکھ سکے کیا لکھا تھا؟
	(۴) پانچ بکسوں کو ان کے وزن کی مناسبت سے تلے اوپر رکھ سکے۔
	(۵) یہ جان سکے کہ آٹھ پیسے دے کر کون سا سکہ (دونی) لے؟
دس سال۔	(۱) سال کے دو مہینے یاد رکھ سکے۔
	(۲) مختلف قسم کے سکوں کو یاد رکھ سکے۔
	(۳) جو دو جملے اسے بتائے جائیں انھیں اپنی عبارت میں لکھ سکے۔
	(۴) پانچ سوالات تک کا جواب بآسانی دے سکے۔
	(۵) حافظہ کی مدد سے مختلف شکلیں بنا سکے۔
بارہ سال۔	(۱) ایسی عبارتوں پر جو خلافِ عقل ہوں نقد و تبصرہ کر سکے۔
	(۲) تین جملوں کو ایک عبارت میں استعمال کر سکے
	(۳) تین منٹ میں بہت سے جملے یاد کر سکے۔
	(۴) کلمات معتوبہ مثلاً صدقہ، عدالت اور شفقت کا مطلب و مفہوم سمجھ سکے۔
	(۵) کسی جملہ کی ترتیب بگاڑ دی جائے تو وہ اسے

بچہ کی عمر	امتحان
بارہ سال :-	ازبیر نو ٹھیک کر سکے ۔
پندرہ سال :-	(۱) سات حسابی ہندسے ، سننے کے بعد دہرا سکے ۔
	(۲) ۲۰ - ۲۵ ٹکڑوں تک کے جملے سننے کے بعد دوہرا سکے
	(۳) جو صورتیں اس کے سامنے پیش کی جائیں ان کی تفصیل بیان کر سکے ۔
	(۴) جس وزن کا کلمہ اس کے سامنے رکھا جائے ۔ اس کے تین الفاظ یاد رکھ سکے ۔

یہ ہے وہ ۱۵ امتحانی معیار جس سے لڑکوں کی ذہانت اور ذکاوت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے ۔

یہ امتحانات جو اوپر درج کیے گئے ہیں ، یہ بجائے خود کافی ہیں لیکن سمجھدار مدرّس : بچہ کی عمر ، سوسائٹی اور گھر کو پیش نظر رکھ کر خود بھی بہت سے امتحانات اس سلسلہ میں وضع کر سکتا ہے ۔ اور خود نئے نئے اصول تراش سکتا ہے ۔

اگر مدرّس چاہے ، تو اس سلسلہ میں ، حسب ذیل کتابیں پیش نظر رکھ سکتا ہے ۔

(۱) "عقلی امتحانات" (۲) ذہانت کا پیمانہ "

اگر مدرّس چاہے تو ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد ، وہ خود سوچ سمجھ کر ان میں تغیر اور زیادتی کر سکتا ہے ۔ بعض امتحانات میں تقدیم وتاخیر بھی کر سکتا ہے ۔

(۳۶)

معلّمین کے لئے

بچّوں کی تربیت کا اندازہ و اسلوب

بچّوں کی تربیت کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام بہت زیادہ غور و فکر، احتیاط اور تجربہ کا پورا محتاج ہے، مختلف عادات و اطوار اور مزاج رکھنے والے بچّوں کے لئے کوئی ایک کلیہ تو نہیں مرتب کیا جا سکتا، پھر بھی ایک عام اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں معلّمین کی رہنمائی کے لئے چند باتیں درج کی جاتی ہیں۔ ان پر اگر عمل کیا گیا تو بہت سی مشکلوں سے نجات مل جائے گی، اور تربیت و تہذیب کا کام نسبتاً آزاد ہو جائے گا۔

تربیت و تہذیب

(۱) کوشش کیجئے کہ اپنے شاگردوں اور بچّوں کی عقلی صلاحیت کا صحیح اندازہ کر سکیں اور ان کی رغبت و میلان کو پہچان سکیں۔

۲ . یاد رکھئے ، بچّوں کے اخلاق وطبائع میں بہت اختلاف ہوتا ہے . ہر بچّہ سے وہی سلوک کیجئے جو اس سے مناسبت رکھتا ہو . جو بات زید کے لئے اچھی ہے ، وہ بکر کے لئے نامناسبت بھی ہوسکتی ہے .

۳ . بچّہ سے یہ کہئے: "ایسا نہ کرو ." بلکہ اسے یہ سننے کا عادی بنایئے کہ "ایسا کرو تو اچھا ہے !" بچّہ کے لئے ایک دروازہ بند کیجئے ، تو دوسرا فوراً کھول دیجئے .

۴ . یہ خیال نہ کیجئے کہ بچّہ سے آپ جو کہہ رہے ہیں وہ سب کچھ سمجھ رہا ہے ، ہوسکتا ہے کہ کچھ کم سمجھے یا بالکل نہ سمجھے .

۵ . کوئی وعدہ کیجئے ، تو ضرور پورا کیجئے .

۶ . کوشش کیجئے ، کہ بچوں کے سامنے آپ ایک بہترین نمونہ بن سکیں . تاکہ آپ ایک اچھا اسوہ بن سکیں ، جس کی تقلید کی جائے .

۷ . بچّہ اگر زمین پر گر پڑے ، یا کھانا چھوڑ دے ، تو پریشان نہ ہو جئے . بلکہ ایسا کام کیجئے ، جس سے اسے مدد ملے .

۸ . بچّہ کی تربیت کے لئے جو اصول یا ضابطے بنایئے . ان میں مستثنیٰ مثال کسی کی نہ رکھیے .

۹ . بچّہ پر اپنی رغبت مسلط نہ کیجیے . اس کی رغبت میں اس کا ساتھ دیجئے .

۱۰ ۔ بچوں کی موجودگی میں ان کے حالات پر بحث نہ کیجئے
۱۱ ۔ بچّہ پر کوئی کام ایک دم سے نہ ڈال دیجئے۔ اسے موقعہ دیجئے کہ وہ آسانی سے اُسے کر سکے۔
۱۲ ۔ بچّہ کا مذاق نہ اڑائیے۔ اس کے ساتھ ہنسئے۔
۱۳ ۔ بچّہ کے کام میں صرف ضرورت کے وقت مداخلت کیجئے۔
۱۴ ۔ بچّہ کی طبیعت پر بھروسہ کیجئے۔
۱۵ ۔ بچّہ کو مناسب آزادی دیجئے۔
۱۶ ۔ بچّہ میں اعتماد نفس کا جذبہ پیدا کیجئے
۱۷ ۔ بچّہ کو مشق و تمرین کا کافی موقعہ دیجیے۔
۱۸ ۔ بچّہ کی حوصلہ شکنی نہ کیجئے۔ اس کی حوصلہ افزائی کیجئے۔ مثلاً "آج تم نے کل سے اچھا کام کیا۔ اُمید ہے کل تم اس سے بھی اچھے ثابت ہو گے۔"
۱۹ ۔ مشکلات کے حل میں بچّہ کی مدد کیجئے۔
۲۰ ۔ بچہ کی غلطیوں کی اصلاح نرمی سے کیجئے
۲۱ ۔ بچّہ کی شخصیت کو ابھاریئے
۲۲ ۔ بچّوں کے ساتھ عدل و مساوات کا برتاؤ کیجئے۔ دو بچّوں میں اگر ایک ہی کام ہو تو یا دونوں کو معاف کر دیجئے یا دونوں کو سزا دیجئے
۲۳ ۔ بچّوں کے جھگڑے کی حوصلہ افزائی نہ کیجیے۔ بلکہ ان میں تعاون اور اشتراک کی روح پیدا کیجئے۔

۲۴ - بچہ میں صداقت کا شعور پیدا کیجئے۔

۲۵ - بچہ کی روح کو ابھاریئے۔

۲۶ - بچّہ کو مایوس نہ ہونے دیجئے۔

۲۷ - یہ تمنا نہ کیجئے، کہ بچّے آپ ہی کے نقش قدم پر چلیں۔ انھیں وہی کرنا چاہیئے، جو ان کی طبیعت کے مناسب ہو۔

افلاطون کا قول ہے: "اچھی ابتدا، کمال و سعادت کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ انگریزی زبان کی ضرب المثل ہے۔ اچھی ابتدا آدھے کام کا ہو جانا ہے۔"

پس اے ماؤں اور باپو! اے استانیوں اور استادو! اپنے بچّوں اور بچیوں اور شاگردوں کے ساتھ اچھا برتاؤ۔ وہ تمہاری محبت اور شفقت کے بھوکے ہیں، تمہارے سوا ان کا کوئی حامی و مددگار نہیں۔ یاد رکھو بچّے بڑی قیمتی پونجی ہیں، جو تمھارے سپرد قدرت کی طرف سے کیے گئے ہیں۔ اس امانت کی حفاظت کرو۔ ان چھوٹی روحوں کو پامال نہ کرو۔ ان کے دلوں کو مرنے نہ دو۔ آج کے بچّے کل کے نوجوان بنیں گے۔ اور ساری قوم ان ہی سے عبارت ہوگی۔ آج اگر اچھی فصل بوؤگے تو کل اچھی فصل کاٹو گے۔

(۳۷)

فنِ تدریس

معلّم کو کیا اور کیسا ہونا چاہیے؟

معلّم کے ذمے بہت بڑا کام ہوتا ہے۔ اور وہ کام ہے علم اور سوسائٹی کی خدمت، اس اعتبار سے معلّم کا درجہ سب سے اونچا اور بڑا ہے۔ خود سرکار دو عالمؐ نے علم کا اعتراف فرمایا ہے اور تعلیم کی طرف رغبت دی ہے۔

جرمنی کے مشہور دینی مصلح مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء، ۱۵۴۶ء) کا قول ہے: اگر مجھے وعظ اور ارشاد سے فرصت ملتی تو میں تعلیم کے سوا کوئی اور کام نہ کرتا۔" اس قول کی روشنی میں، اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مدرسہ ہی دراصل اصلاح و تعمیر کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہ مدرس ہی کا کام ہے کہ وہ اپنی قوم کو ترقی یافتہ بنا دے، اور اسے ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے

ارسمس کا قول ہے: "مجھے ایک مدرسہ سونپ دو۔ میں ساری دنیا کو منقلب کر دینے کا عہد کرتا ہوں۔"

معلّم کا کام

معلّم کا کام کیا ہے؟ وہ کیا کرتا ہے؟ وہ بچوں اور نوجوانوں کے افکار میں جلا پیدا کرتا ہے، ان کے شعور کو بیدار کرتا ہے۔ ان کی عقلوں کو زندگی بخشتا ہے۔ ان کے ادراک کو ترقی دیتا ہے وہ انھیں باطل کے مقابلے میں حق کے ہتھیاروں سے مسلح کر دیتا ہے۔ انھیں فضیلت کے ہتھیار دیتا ہے تاکہ وہ رذیلت کو ہلاک کر دیں، انھیں علم دیتا ہے تاکہ وہ جہل کا خاتمہ کر دیں۔ وہ تھکی ماندی روحوں کو زندگی کا پیام دیتا ہے۔ سوئی ہوئی عقلوں کو جگا دیتا ہے۔ ضعیف شعور کو توانا کر دیتا ہے وہ ایک روشن مشعل ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ کہ راستہ کی تاریکی دور ہو جائے، وہ مردہ زمین کو پھر سے سرسبز کر دیتا ہے، وہ لنڈ منڈ درخت کو بارور کر دیتا ہے۔

تعلیم، رہبانیت کی ایک قسم ہے۔ جس طرح ایک راہب دین کے لئے دنیا کو چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح ایک عالم، علم کے سوا، ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کسی ایسے راہب کو دیکھیں جو حُبّ دنیا اور حب جاہ کے مرض میں گرفتار ہو تو سمجھ لیجئے۔ کہ وہ سچا اور پکا راہب نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آپ کسی عالم کو سیم و زر کا بندہ دیکھیں تو یقین کر لیجئے، اس کا علم کھوٹا ہے

دنیا کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ لوگ جن کاموں کے لئے خلق نہیں ہوتے ہیں، وہی کرتے ہیں۔ یہ بہترین دستکار بن سکتا ہے۔ لیکن وکالت کے پیچھے پڑا ہے۔ وہ بہترین وکیل بن سکتا ہے۔ لیکن دستکاری میں الجھا ہوا ہے۔ یہ طبقہ معلمیت کی صف میں بھی موجود ہے۔ بعض لوگ پیدا ہوئے ہیں روپیہ پیدا کرنے کے لئے، لیکن پیشہ معلمی کا اختیار کر رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دنیا میں ناکام رہتے ہیں، نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے!

لیکن معلمین کی کچھ شکایتیں بھی ہیں، اور وہ بجا بھی ہیں، راہب کو ہماری سوسائٹی، اچھی غذا، اچھا لباس دیتی ہے، اور معلم اس سے محروم ہے۔ راہب شادی نہیں کرسکتا۔ اپنی خانقاہ میں مگن رہتا ہے۔ اس پر کسی کا بوجھ نہیں ہوتا۔ معلم کو شادی کرنا پڑتی ہے۔ خانگی زندگی بسر کرنا ہوتی ہے، دوسروں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن اس کی اس مشکل کو آسان کرنے کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔

لوگوں کو اگر عقل سے دشمنی نہ ہوتی۔ تو وہ معلم کو ہر ضرورت دنیاوی سے بے نیاز کر دیتے۔ اگر وہ اشیا کی قدر و قیمت کا اندازہ رکھتے ہوتے، تو معلم کی قیمت سب سے زیادہ لگاتے۔

مدرس کی حیثیت

ہمیں مدرس کی حیثیت اور اہمیت پورے طور پر محسوس کرنی چاہیئے۔ تاکہ اپنے

اقوال و افعال اور حرکات و سکنات میں مدرسہ کے اندر اور باہر کھیل کے میدان میں اور کلاس کے اندر، ایک بہترین اور قابل تقلید نمونہ طلبہ کے لئے بن سکے۔ ایسے طریق تدریس سے آشنا ہونا چاہیئے۔ بچّوں کی نفسیات پر بھی غور ہونا چاہیئے۔ تاکہ ان کی صحیح تربیت کر سکے۔

شاگردی سے اُستادی تک طالب علم کو مدرسہ کے اندر تربیت گاہ کے اندر، ٹریننگ کالج میں ہر جگہ اور ہمہ وقت طالب علم ہی رہنا چاہیئے، بحث و درس اور تنقیب و اطلاع سے اُسے پوری رغبت ہونی چاہیے۔ صرف اسی طرح وہ سچّا اور مکمل مدّرس بن سکتا ہے، اور پھر اس کا شمار بہترین ماہرین تعلیمات میں ہو سکتا ہے۔

مدرس کی اصلاح مدرسین کا ایک بہت بڑا طبقہ اصلاح کا محتاج ہے۔ ان کا اکثر وقت ضایع ہو جاتا ہے، اور طلبہ ان سے ذرا بھی فائدہ نہیں اُٹھا پاتے۔ مدرس کو چاہیئے کہ وہ خود ہی اپنے دل سے حسب ذیل سوالات کرے۔

۱۔ کیا وہ اپنی وسعت کے اوقات کا صحیح استعمال کرتا ہے

۲۔ کیا اس کی ذہنی و بدنی ریاضتوں کا کوئی نتیجہ نمودار ہوا؟

۳۔ کیا اس کے شاگردوں میں اس مقصد کی لگن پیدا ہوئی جسے پیدا کرنا چاہتا تھا؟

وہ مدرس ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا جس کی کوششیں ناکام ہوں، اور جس کے عمل کا نتیجہ سامنے نہ ہو۔ اور جس کے شاگرد، اس سے پورے طور پر مستفید نہ ہوتے ہوں۔

مدرس کا فرض تربیت جدیدہ کے اصولوں میں سب سے اہم اصول یہ ہے کہ معلم طلبہ کے کاموں میں از خود دخل نہ دے، بلکہ انھیں موقع دے کہ وہ خود اپنا کام کریں۔ معلم صرف اس وقت دخل دے جب وہ خود مدد کے طالب ہوں،

مدرس کا کام اور فرض یہ ہے کہ وہ طلبہ میں لگن پیدا کرے۔ انھیں تفکر مستقل اور عمل مستقل کا عادی بنائے۔ انھیں کثرت مطالعہ کی ترغیب دے۔ انھیں تلاش و تجسس کی لذت سے آشنا کرے، ان کی معلومات منظم کرے، اور ان کے عمل کو پرکھے ان کی نگہداشت کرے، کہ وہ غلط راستے پر نہ چل پڑیں۔ اور جب وہ حاجت مند ہوں تو ان کی مدد کرے۔

مدرس کو چاہیئے، کہ ہر روز وہ اپنے دل سے پوچھتا رہے:

(۱) میں کس طرح پڑھاتا ہوں؟
(۲) طلبہ میں تعلیم کی لگن کس طرح پیدا کر سکتا ہوں؟
(۳) اپنے رکھ رکھاؤ کے ساتھ کس طرح میں شاگردوں کو نشاط ورغبت کے ساتھ آمادۂ کار کر سکتا ہوں؟
(۴) اپنے شاگردوں کو وہ آزادی کس طرح دوں کہ مجھے مداخلت

کی ضرورت نہ پڑے، اوران کے کام انہی پرچھوڑ دوں؟

مدرس کے واجبات

مدّرس اگراپنے پیشہ میں کامیاب ہونا چاہتا ہے، تواس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تربیّت کے جدید اصولوں سے پوری طرح واقف ہو، جو یہ ہیں:-

(۱) مدرس کا عمل منظّم اور مرتب ہونا چاہیئے۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اسے آج کیا کرنا ہے؟ اس ہفتہ میں اسے کیا کرنا ہے؟ یہ موضوع کہاں سے شروع ہوتا ہے، کہاں ختم ہوتا ہے؟ وہ اپنے کام کوکس طرح تقسیم کرے کہ سال بھر کے اندر کورس بھی پورا ہوجائے، اور طلبہ کو مراجعت اور اعادہ کا وقت بھی مل سکے؟

(۲) مدّرس کو چاہیئے کہ درس اس طرح دے کہ ساری جماعت اسے اچھی طرح سمجھ لے۔ مدرس کا کام طلبہ کی رہنمائی ہے جس کی ترغیب دینا ہے، یہاں تک کہ وہ خود فکر و عمل کے پر قادر ہو جائیں۔

(۳) اسباق کے ماتحت فرد، اور جماعت کے لئے کام معیّن کرے، اور دیکھے کہ حقل و استعداد کے مطابق، ہر ایک اپنا کام کررہا ہے یانہیں؛ مدّرس کو چاہیئے کہ وہ اپنے طلبہ کے لئے، اخبار کا منبع علم کا مصدر بن جائے، جومدد کا طالب ہو۔ اس کا مددگار بن جائے، آپس کے تنازعات کا فیصلہ کامل عدل اور پوری

غیر: غیر جانب داری کی ساتھ کرے۔ وہ ایسا سراپا محبت و شفقت باپ بن جائے۔ جو اپنے بچّوں کو ترقی یافتہ دیکھنا چاہتا ہے۔ ان کی منفعت کے بارے میں ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ انھیں عمل کی ترغیب دیتا رہے۔

(۴، مدّرس کو اس نصیحت پر ہمیشہ عمل کرنا چاہیئے۔ کہ شاگردوں سے باتیں کم کرو۔ نگرانی زیادہ کرو۔ دیکھو ان کا کون سا پہلو مضبوط ہے، اور کون سا کمزور؟ یاد رکھو، کم کام، اگر وہ صحیح ہو، زیادہ کام سے بہتر ہے، مدرس کو یہ بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ تلامیذ نصیحت اور رہنمائی کے جویا رہتے ہیں، یہ قطعاً مناسب نہیں کہ مدّرس لکھ دے، اور وہ نقل کر لیں۔ بغیر معنی اور مطلب سمجھے ہوئے، اس طرح انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

(۵، طفل کو تفکیر کا عادی بنانا چاہیئے۔ اسے مناسب آزادی دینی چاہیے۔ کہ وہ اپنا کام خود کر سکے، اپنے آپ پر اعتماد کر سکے۔ یہاں تک کہ پیش آمدہ تمام دشواریوں پر خود ہی غالب آجائے

(۶، یہ بہت بڑی غلطی کہ اطفال کو دفعتہً بہت زیادہ آزادی دے دی جائے۔ آزادی عمل رفتہ رفتہ دینی چاہیئے۔ پوری اور کامل نگہداشت کے ساتھ۔

(۷، تلامیذ کو اس کا خوگر بنانا چاہیئے کہ وہ دوسری طرف دیکھے بغیر اپنے اوپر اعتماد کر سکیں۔

۸، بچّوں کی نگرانی بچوں اور شاگردوں کو اس طرح آزادی کار ملنی چاہیئے۔ کہ وہ یہ نہ محسوس کر سکیں کہ کوئی ان کے سر پر کھڑا ہے۔ وہ اطمینان و دل جمعی کے ساتھ اپنا کام کریں۔ اگر بچہ کو کام کی پوری فرصت نہ دی جائے۔ اور اسے موقع نہ عطا کیا جائے۔ تو وہ صحیح طور پر اپنا مفوضہ کام نہیں انجام دے سکتا۔ یہ اعتماد علی النفس کا کام گھر اور باہر ہر جگہ ہونا چاہیئے۔ ماں کو چاہیئے کہ ہر وقت وہ بچہ پر پابندیاں نہ عائد کرے۔ کبھی کبھی اسے تنہا بھی جانے دے، جو ماں ہر وقت بچّہ کو سینہ سے چمٹائے رہتی ہے۔ وہ اس سے سچی محبت نہیں کرتی، بلکہ اسے غلام فطرت بنا دیتی ہے۔ وہ اس سے اعتماد نفس کی نعمت چھین لیتی ہے۔ وہ اسے موقع نہیں دیتی کہ وہ خود سے اُٹھے، خود سے بیٹھے خود سے زندگی کا مقابلہ کرے۔ ہر وقت اس پر مسلط رہتی ہے، اسے ذرا بھی آزادی نہیں دیتی وہ اس کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے، اور اس مغالطہ میں مبتلا رہتی ہے کہ اس سے بہت زیادہ محبّت کا اظہار اس کے ساتھ دوستی نہیں دشمنی ہے۔

ایک اچھے مدرس کا کام یہ ہے کہ وہ بچہ پر مسلّط رہے، لیکن اسے محسوس نہ ہونے دے، اس کے اشاروں کو سمجھے، اس کی مرضی کو پہچانے، اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے،

لیکن کمزور بن کر نہیں۔ اس پر حکمرانی کرے، لیکن سختی کے ساتھ نہیں۔

۹۔ آزادی مدرس کو یاد رکھنا چاہیئے کہ تربیت جدیدہ نے آزادئ عمل کی بہت بڑی گنجائش تلمیذ کے لئے رکھی ہے۔ یہ آزادی بہت سوچ سمجھ کر دینی چاہیئے۔ ایک لڑکے کے لیئے جتنی آزادی مناسب ہے، دوسرے کے لیئے وہ قطعی مضر ہے، وہ آزادی بھی کوئی قیمت نہیں رکھتی، جس میں ایک آدمی ہر کام میں دوسرے کی امداد واعانت کا محتاج اور جویا ہو۔ وہ آزادی بھی بے معنی ہے جس میں میلان ورغبت پر پہرے لگے ہوں بچہ کو آزادی اس طرح دینی چاہیئے۔ اور اس میں آزادی کے استعمال کا ملکہ اس طرح پیدا کرنا چاہیئے کہ خود برائی اور اچھائی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

مدرس کا عمل اور اثر کوئی دانش مند بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ قوم اور سوسائٹی کی ترقی اور فروغ میں مدرس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ علمی ادبی، خلقی، انفرادی، اجتماعی، ہر اعتبار سے، مدرس کا سب سے اہم کام اصلاح ہے۔ ان عیوب کی اصلاح، جو سوسائٹی میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور فرد کو خراب کرتے رہتے ہیں۔ ہم مدرس سے صرف یہی توقع نہیں کرتے کہ وہ صرف درس پر اکتفا کرے گا،

ہم تو اسے ایک ایسا اسوہ اور نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں، جس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ جس کی تقلید کی جا سکے۔

مدرس کا اثر اپنے تلامذہ پر وہی ہوتا ہے، جو باپ کا اپنی اولاد پر۔ ایک اچھا مدرس مدرسہ کیا، سوسائٹی تک کی اصلاح کر سکتا ہے

مدرس کو چاہیئے کہ وہ طلبہ کے لیئے ایسا نمونہ بن جائے جس کی وہ پیروی کریں۔ اسی کے نقش قدم پر چلیں۔ کردار و اعمال میں اسی کے اثر سے متاثر ہوں۔ معلم صرف نام ہی کا معلم نہیں ہوتا۔ وہ حقیقی معلم ہوتا ہے۔ اس کا اثر روح، ذہن اور دماغ سب پر ہوتا ہے۔ تعلیم سے بڑھ کر متقدس کوئی کام نہیں۔ معلم جیسے اونچے لقب کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو اہل ہو۔ جو مرد کامل ہو، جو پستی سے دور ہو۔ بلندی کا خوگر ہو۔

جیسا مدرس ویسا مدرسہ

جیسا "مدرس ویسا مدرسہ" یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ ایک حقیقت ہے اس لیئے کہ مدرس، طلبہ کے لیئے ایک نمونۂ کامل ہوتا ہے، جس کی وہ پیروی کرتے ہیں۔ اس کے اطلاق و عادات، حرکات و سکنات، افکار و آرا، قول و افعال سب کی تقلید وہ کرتے ہیں۔ پس اگر مدرس اچھا ہوگا، تو مدرسہ میں بھی وہی فضا پیدا ہو جائیگی ورنہ نہیں یہ بالکل مدرس کے اختیار میں ہے۔ کہ وہ اپنے طلبہ اور مدرسہ

کو جس رنگ میں چاہے رنگ دے، اور جیسا چاہے بنا دے۔

معلمی کی تیاری تدریس کا کام کرتے ہوئے خاص قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ مدرس کی مشغولیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا کام بہت بڑا ہوتا ہے۔ معلمی کا کام کرنے کے لئے صبر، برداشت اور تحمل کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ مدرس کو اخلاق کا پاکیزہ ہونا چاہیئے تعلیم اسے طبعی رغبت ہونا چاہیئے۔ اسکول کے کورس سے اسے پوری واقفیت ہونی چاہیئے۔

مدرس اور نصاب مدرس کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے کورس سے واقف ہو، بلکہ یہ بھی ہے کہ سارے نصاب پر اس کی وسیع نظر ہو۔ تاکہ وہ اپنے علم اور طرز تعلیم سے طلبہ کے قلوب پر چھا سکے۔

سب سے پہلے مدرس کو مادّہ تعلیم پر غور کرنا چاہیئے۔ اگر وہ کورس پر قادر اور غالب ہے، تو وہ آسانی کے ساتھ کامیاب ہوگا۔ اسے چاہیے کہ جو سبق پڑھائے اس کی پہلے سے مکمل تیاری کر لے۔ اپنی فرصت کے اوقات حصول معلومات میں صرف کرے۔ جو مدرس ان امور کا لحاظ نہیں کرتا، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

عمل کی محبت مدرس اگر چاہے، تو وہ اپنے طلبہ کے اندر علم،

مدرسہ اور عمل کی محبت پیدا کر سکتا ہے، اپنے اسباق ذہنی اور عملی طور پر ان کی رگ و پے میں جاری و ساری کر سکتا ہو لڑکوں میں علم کا ایسا شوق پیدا کر سکتا ہے کہ جب تک درس ختم نہ ہو جائے۔ اُن کا اُٹھنے کو جی نہ چاہے۔ تلامذہ میں تشویش پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ مدرس اور نصاب مختصر ہو۔ زیادہ طویل نہ ہو، اور درس میں ہاتھ سے کرنے والے کام بھی شریک ہوں۔

حفظ نظام جو مدرس اپنے شاگردوں کو ضبط و نظام کا خوگر نہ بنا سکے، اور بغیر کسی مار دھاڑ، ڈانٹ ڈپٹ کے محض اپنی شخصیت کے اثر سے انھیں راہ راست پر نہ لا سکے، وہ اس قابل نہیں کہ اسے مدرس کہا جائے۔ وہ اس کا اہل نہیں کہ مدرس بنایا جائے۔

مدرس پر اعتماد طلبہ کو مدرس پر اتنا ہی اعتماد ہونا چاہیئے۔ جتنا فوج کو کمانڈر پر ہوتا ہے۔ اگر فوج اپنے جرنیل پر اعتماد نہ کرے تو شکست، بغاوت یا فرار یقینی ہے۔ اس طرح اگر طلبہ اپنے معلم پر اعتماد نہ کرتے ہوں، تو نہ وہ کامیاب ہو سکتے ہیں، نہ یہ۔

اخلاص عمل طلبہ جس مدرس کو اچھا معلم دیکھتے ہیں۔ اُسے چاہنے لگتے ہیں اور اپنے ایام شباب میں

بالکل ویسا ہی بن جانے کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے طلبہ کے سامنے سب سے بڑی اور بہتر مثال ہوتا ہے۔ اس کی موجودگی ان میں علم کا شوق پیدا کرتی اور اس کی قدر و قیمت بڑھاتی ہے۔

یاد رکھنا چاہئے۔ اگر مدرس اپنے کورس پر غالب ہے، تو اس کی کامیابی یقینی ہے۔ لیکن اسے بھی نہ بھولنا چاہیے۔ کہ مدرس کو کثرت مطالعہ کا عادی ہونا چاہیے۔ اپنے موضوع کے علاوہ دوسرے موضوں پر بھی اس کی اچھی نظر ہونی چاہیے۔ مدرس کا موضوع اگر جغرافیہ ہے، تو اسے تاریخ داں بھی ہونا چاہیے۔ علم طبقات الارض اور نباتات میں درک ہونا چاہیے۔

---

(۳۸)

مدّرس کی کامیابی

کا

دوسرا اہم ترین عامل

آپ بہت سے ایسے آدمیوں کو دیکھیں گے جنھوں نے معلّمی اور استادی کا پیشہ اختیار کرلیا ہے۔ لیکن طبعاً جنھیں تدریس وتعلیم سے ذرا بھی مس نہیں ہے، جو تربیت اور مدارس کے ضبط و نظم کے فن و اصول سے قطعاً ناواقف ہیں۔ جو بچّوں کو، اور ان کے طبائع کو ذرا بھی نہیں پہچانتے۔ یہ اس کے مستحق ہیں کہ بجائے اس کے پڑھائیں، خود پڑھیں اور خوب پڑھیں علوم تربیت میں درک پیدا کریں اور سیکھیں کہ کس طرح پڑھایا جاتا اور تعلیم دی جاتی ہے۔ انہی لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں، جنھیں طبعاً اور فطرتاً، تعلیم و تدریس سے دلچسپی ہے، کھوج لگانے کے بعد معلوم ہوگا، ان کی بچپن سے یہ عادت تھی، کہ مدرسہ میں جو کچھ پڑھ

کر آتے، اپنے گرد اپنے چھوٹے بچوں کو جمع کر لیتے، اور انھیں پڑھانے لگتے۔ ایسے لوگ اگر فن تعلیم و تربیت میں دستگاہ پیدا کر لیں، تو یہ بہترین مدرس بن سکتے ہیں۔

ایک قصہ ایک مرتبہ ایک مدرس نے شکایت کی کہ وہ پڑھانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس سے پوچھا گیا "فن تربیت و تعلیم پر خود تم نے کیا پڑھا ہے؟" اس نے جواب دیا: "کچھ نہیں!" اس سے کہا گیا: "پھر اگر تم ناکام ہو، تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

یہ مدرس پھر ایک ٹریننگ کالج میں داخل ہوا۔ اس نے تربیت و تعلیم سے متعلق کتابوں اور مجریدہ رسالوں کا اندھا دھند مطالعہ شروع کر دیا۔ علم النفس پر جو کتاب ملی، دیکھ ڈالی، یہاں تک کہ اس میں تعلیم دینے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ اور تدریس کے فن پر اچھی نظر ہو گئی۔ نیا مدرس جب کسی درجہ میں قدم رکھتا ہے، تو وہ حیران و پریشان ہو جاتا ہے کہ کیا کرے؟ اس پریشانی و حیرانی کا علاج صرف یہ ہے کہ فن تربیت سے متعلق زیادہ سے زیادہ واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ تربیت میں سے اکثر کا خیال ہے کہ "معلم بنایا نہیں جاتا بنتا ہے!"

چند اور باتیں ایک مدرس کے لئے اپنے فن کی تعلیم کے علاوہ چند اور باتوں کی طرف بھی متوجہ ہونا ضروری ہے

(۱) مدرس کو کافی وقت ملنا چاہیے۔ کہ وہ دوسرے مدارس کا معائنہ کرے، وہاں کا طریق تعلیم اور انداز تربیت دیکھے۔ یہ مطالعہ ناقد کی حیثیت سے نہیں، متعلم کی حیثیت سے ہونا چاہیے۔ یعنی جو اچھا ہو۔ وہ لے لے، جو بُرا ہو اُسے ترک کردے۔

(۲) مدرس کو چاہیے کہ وہ تمام لیکچروں میں شرکت کیا کرے۔ اس سے اس کی علمی منزلت میں اضافہ ہوگا۔ ہر لیکچر سے کچھ نہ کچھ کام کی باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں۔

تربیت کی تعلیم

جس طرح علم حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح تربیت کی تعلیم بھی حاصل کرنی چاہیئے یہ بھی ایک مستقل فن ہے، ایک حکایت سُنئے:-

(۱) ایک مدرسہ میں ایک نوجوان کا مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ یہ شخص فن تربیت و تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھا۔ لیکن اپنے کام میں تندہی اور اخلاص کے ساتھ لگ گیا۔ لیکن ناکام۔ چند ہفتوں کے بعد تو زندگی اس پر تنگ ہو گئی۔ آخر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی ساری اُمیدیں اکارت گئیں جو اس نے مدرس بننے سے متعلق باندھ رکھی تھیں۔ ایک دن اس کی ملاقات اپنے اُستاد سے ہوئی، جو اسے بہت چاہتا تھا۔ اُستاد کے سامنے وہ اُبل پڑا، اور اپنی دکھ بھری کہانی سنا ڈالی۔ اُستاد نے کہا۔ "بے شک تم کامیاب مدرس نہیں بن سکتے۔ لیکن جانتے ہو

کیوں نہیں بن سکتے ؟ کیا تم نے تربیت و تعلیم سے متعلق ایک کتاب بھی پڑھی ہے ؟" پھر اس نے نصیحت کی کہ کسی ٹریننگ کالج میں پہلے ٹریننگ لے لو۔ پھر مدرس بنو۔ یہ بات اس کے دل پر جم گئی۔ وہ ایک ٹریننگ کالج میں داخل ہو گیا، اور فن تعلیم و تربیت پر اس نے مہارت حاصل کر لی۔ پھر جو وہ مدرس بنا ہے، تو تمام ہمسروں سے بازی لے گیا

(۲) مدرس میں ذکاوت کے ساتھ قوتِ تحقیق بھی ہونی چاہیئے یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک بغیر دوسرے کے بیکار رہے

(۳) علم کے ساتھ تجربہ بھی لازمی اور ضروری ہے۔

(۴) صرف تجربہ ناکافی ہے۔ تجربہ کے ساتھ اچھا ماحول، اور اچھی صحبت بھی لازمی ہے۔



(۳۹)

مدرس کے صفات

اب ہم ان صفات و خواص کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، جو مدرس میں کثرت کے ساتھ ہونے چاہئیں۔

پہلے باپ یا مدرس

مدرس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں سے وہی محبت کرے جو ایک باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے، اور ان کے بارے میں اسی طرح فکر مند ہو جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کے لئے فکر مند ہوتا ہے۔ ہر تربیت دہندہ کو یہ بات یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قبل اس کے کہ وہ کسی کو آدمی بنانا چاہے۔ خود آدمی بن لے، اپنی اولاد کو اگر کامل بنانا چاہتے ہو، تو پہلے خود کامل بنو۔ اپنے بیٹوں کو اخلاقِ فاضلہ کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتے ہو۔ تو خود بھی صاحب اخلاق بنو۔

اپنے بیٹیوں اور شاگردوں کا احترام کرو۔ وہ تمہارا احترام کریں گے
بچّہ کی شخصیت کا احترام کرو۔ تاکہ وہ اپنے امیال وعواطف ظاہر کرسکے۔
ایک مدّرس اگر اپنے فن اور علم سے پورے طور پر واقف ہے
تو بھی وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ جب تک اس کا دل بچوّں اور
شاگردوں کی محبّت سے لبریز نہ ہو۔ جو مدرسہ اطفال کی محبت سے
خالی ہو وہ تلامیذ اور مدرسین کا اکھاڑہ بن جاتا ہے۔ اگر معلمین کے
دلوں میں شاگردوں کی محبت نہیں ہے تو وہ اس سے بھاگیں
گے۔ اس کے خلاف دل میں کینہ رکھیں گے۔ آپ اکثر دیکھیں گے۔
شروع شروع میں بچےّ معلّم سے محبت کرتے ہیں، پھر جیسے جیسے
پہچانتے جاتے ہیں، اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، مدرسہ میں آنے
سے ہچکچانے لگتے ہیں۔

ولایات متحدہ امریکہ کے ایک مدرسہ کا واقعہ ہے کہ ایک مدّرس
نے مدرسہ کے پرنسپل کو ایک طالب علم کی رپورٹ بھیجی کہ اسے
اس کے درجہ سے کسی دوسرے نیچے درجے میں منتقل کردیا جائے۔
اس لئے کہ وہ شریر اور مجرمانہ ذہنیت کا لڑکا ہے۔ یہ لڑکا بہت
بدزبان، بد اخلاق اور روکھا سوکھا تھا۔ پرنسپل نیا نیا آیا تھا۔ وہ
اس لڑکے کی خانگی حالت سے ناواقف تھا۔ اس نے لڑکے کو اپنے
دفتر میں بلایا، اور اس سے باتیں کیں۔ اس نے سوچا سزا دینے
سے پہلے اس کے والدین سے بھی پوچھ گچھ کرلینی چاہیئے۔ چنانچہ وہ

وہ اس کے گھر گیا۔ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ صرف ننہ کو رڑھی یاں تھیں۔
ماں گھر میں تھی۔ پرنسپل نے اسے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ اور
لڑکے کی شکایت کی۔ اور بتایا کہ وہ اس کا درجہ گرا دے گا اور
بید مارے گا۔ لیکن ماں نے کچھ پروا بھی نہیں کی۔ اب وہ واپس
جا ہی رہا تھا۔ کہ ایک بدصورت اور شقی آدمی آتا ہوا دکھائی دیا۔
پرنسپل کو یقین ہو گیا۔ یہی باپ ہے۔ اس نے اسے بھی تمام
واقعہ کی خبر دے دی۔ باپ نے پرنسپل کے سامنے لڑکے کو
خوب ٹھونکا۔ اور پرنسپل سے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔
آئندہ آپ یہاں آنے کی تکلیف نہ کیجئے گا۔ آپ کو اجازت ہی
جب جی چاہے اسے قتل کر دیجئے!"

پرنسپل لڑکے کو اپنے ساتھ مدرسہ واپس لایا۔ یہ رنگ دیکھ کر
اس کا غصہ اُتر گیا۔ اور بچّہ سے رحم کا برتاؤ کرنے کا خیال اس
کے دل میں پیدا ہو گیا۔ اور بجائے سزا دینے کے اس سے وہ ملاطفت
کا سلوک کرنے لگا۔

اُستاد اور شاگرد مدرس اور تلمیذ کے درمیان روحانی رشتہ
اور تعلق ہونا چاہیے۔ وہی رشتہ جو باپ
کا بیٹے کے ساتھ ہوتا ہے اگر ہم یہ کہیں کہ ہمارے ہاں زیادہ تر
مدرس اور تلمیذ کے درمیان ضرب و عقاب کا رشتہ ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا
مدرس اپنے طلبہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، وہ ان سے الگ تھلگ

رہتا ہے۔ اس اندیشہ سے کہ اگر ان میں گھل مل گیا تو اپنی کرامت اور بزرگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لیکن یہ بالکل سہل خیال ہے۔ مدرس اگر صحیح طور پہ اپنے فرائض انجام دے تو واقعی وہ باپ کا درجہ حاصل کرسکتا ہے۔ اس کی تعزیر میں بھی شفقت جھلکتی ہو۔ غبی اور شریر سب اس کی محبت سے سیراب ہوتے ہیں۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مدرس کو باپ کا قائم مقام ہونا چاہیے، تو باپ سے ہماری مراد صرف باپ نہیں ہے۔ ماں باپ دونوں ہیں۔ مدرس ماں اور باپ دونوں کی نیابت کرتا ہے۔ اس میں باپ کی سختی اور ماں کی نرمی دونوں چیزیں ہونی چاہئیں۔

۳۔ بچے اور بچپن کی تعلیم

ہمارے دور میں ہماری سوسائٹی کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ چھوٹے بچوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ یہ خیال کچھ عام سا ہوگیا ہے کہ بچہ طبعاً شریر ہوتا ہے، اور اس کی شرارت صرف سونٹے ہی سے دور کی جاسکتی ہے۔ اس کے فطری میلانات اور طفلی لذات کا قلع قمع کرنے کا واحد ذریعہ ڈنڈا ہے۔ اسی جہالت کے سبب آبا بچوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے اور ان سے امر محال کی توقع کرتے ہیں۔ بچپن ہی کے زمانہ میں انھیں کسب معیشت پر لگا دیتے ہیں۔ خواہ

وہ کارخانہ کی مزدوری ہو۔ یا کسی گھر کی ملامت۔ کیا قوم سمجھتی ہے کہ وہ کانٹے بوئے گی، اور گلاب کے پھول کاٹے گی؟ ہرگز نہیں۔ وہ وہی کاٹے گی، جو بوئے گی۔ وہ کانٹے کاٹے گی۔ گلاب کے پھول نہیں۔

بچوں کی عدالت کے ایک امریکی جج نے ایک مقدمہ میں اپنا فیصلہ دیتے ہوئے صاف و صریح الفاظ میں اعتراف کیا تھا کہ ان جرائم کے اسباب میں۔" بچوں کی عدم نگہداشت اور عدم تربیت ہی سب سے بڑا سبب ہے۔

اگر بچہ کی تربیت پر پوری توجہ کی جائے۔ اسے اچھی سوسائٹی اور اچھا گھر ملے۔ اس کے معاملات میں حکمت ملحوظ رکھی جائے۔ مدرس اور تلمیذ کے درمیان محبت اور شفقت کارشتہ ہو۔ باپ بیٹے کے درمیان عمدہ برتاؤ ہو۔ تو ایک شیطان رجیم بچہ بھی ملک کریم بن سکتا ہے۔

مدرس کو اپنے شاگردوں سے الگ تھلگ نہیں رہنا چاہیئے بلکہ ان میں گھل مل کے رہنا چاہیئے۔ اگر وہ ان کے ساتھ کھیل کے میدان میں گیند کھیلے، باغ کی تربیت و تنظیم میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ غرض ان کے تمام اعمال میں شریک و سہیم بن جائے۔ تو اور اچھا ہے۔ اسے یہ اندیشہ ہرگز نہیں کرنا چاہیئے کہ اس طرح اس کا اجلال و احترام طلبہ کے دل سے کم ہو جائے گا۔ اس

لیے کہ احترام تو ایک ایسا روحانی رشتہ ہے، جو اخلاص، اتحاد اور تعاون ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ سوچنا چاہیے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے، کہ اگر پرنسپل مدرسین سے کمانڈر فوج سے، مدرس طلبہ سے بے تعلق رہے، تو اچھے اور خوش گوار نتائج کیونکر مرتب ہو سکتے ہیں؟

(۴، مدرس اور سوسائٹی) مدّرس کو ہر قدم پر سوسائٹی کے افادہ کا خیال رکھنا چاہیے۔ اسے ہمیشہ یہ محسوس کرنا چاہیئے۔ کہ تعلیم کی ہر شاخ سوسائٹی کے درخت ہی کا ایک جزو ہے۔ اس طرح مدّرس اپنے طلبہ کے ساتھ قوم اور سوسائٹی کی بھی بڑی خدمت کر سکتا ہے۔

(۵، مدرّس کا نمونہ) مدّرس کو طلبہ کے سامنے ایک اچھا نمونہ بن کر آنا چاہیے، کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کی طرف مائل ہی نہ ہو سکیں۔ بچہ سے بڑھ کر بہترین ناقد کوئی نہیں۔ اس کی نظر میں لوث اغراض نہیں ہوتا۔ وہی کہتا ہے جو اس کا اعتقاد ہوتا ہے۔ عقل و شعور کے سوا اس کا کوئی اور رہنما نہیں ہوتا۔ وہ آپ سے سچّی محبت کرے گا، دل سے آپ کی اطاعت کرے گا۔ اگر یقین کرلے گا کہ آپ اس کے مستحق ہیں، لیکن پہلے آپ اس کے بن جائیے۔ اسے حکم نہ دیجیے۔ سمجھائیے۔

فریزبل کا قول ہے :-

" معلّم اور تلمیذ، امر اور اطاعت کے درمیان ضروری ہے۔ کہ ایک حکم اور ثالث کار فرما ہو۔ جو معلّم اور متعلم دونوں کے لئے یکساں کار آمد ہو۔ یہ حکم یا ثالث حق ہے، یعنی عدالت جو کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے۔"

(۶) مدّرس اور اخلاص

مدّرس اور اس کے طلبہ کی کامیابی کا سب سے بڑا وسیلہ اور ذریعہ صرف اخلاص ہے۔ سبق پڑھانے کی تیاری نہ کرنا اور درجہ میں تعلیم دینے کے لئے پہنچ جاتا اخلاص نہیں ہے۔ یہ تضیع اوقات ہے۔ جس سے طلبہ کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ وقت مقررہ پر مدّرس اگر درجہ میں نہ پہنچے، تو اس سے بھی طلبہ کو کوفت ہوتی ہے۔ اور ان میں بددلی پیدا ہوتی ہے۔ مدّرس کو اپنے طلبہ کے سامنے حفظِ اوقات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے۔ اگر مدرس اپنے کلاس میں پانچ منٹ لیٹ آیا ہے اور درجہ میں فرض کیجئے، چالیس طالب علم ہیں، تو گویا مدّرس نے پانچ نہیں دو سو منٹ ضائع کیئے۔

مدّرس کو یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کہ اس کا کام ناتمام نہ ہو۔ اور وہ اپنے فرائض وواجبات میں کوتاہی کا مجرم نہ ہو۔ اس

سے کلاس کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اور درجہ کھیل کا میدان بن جاتا ہے جہاں تعلیم کی آواز نہیں گونجتی۔ ہنگامہ اور شور و غل سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ جس کا جی چاہتا ہے۔ کھیلتا ہے۔ کوئی گانے لگتا ہے۔ اور کوئی ناچ میں مہارت پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ کتابیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہوتی ہیں۔ طلبہ ایک دوسرے سے گندے مذاق کرنے لگتے ہیں، جس سے مدرسہ اور درجہ کا ضبط و نظم بالکل ختم ہو کر رہ جاتا ہے

(۷) مدرّس اور زندگی

مدرّس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مدرسہ کے باہر کی زندگی — سیاست، اجتماعیت، ادبیت، علمیت، فنیت — سے پورے طور پر آشنا ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنے طلبہ کی زندگی سنوار سکے۔ انھیں آئندہ زندگی کے لئے تیار کر سکے۔ اگر وہ خود ان چیزوں سے بے بہرہ ہے، تو اپنے شاگردوں کو کیا بتائے گا؟

مدرّس اگر یہ چاہتا ہے کہ تلامیذ کے نفوس میں اس کی بہت زیادہ عظمت و منزلت ہو۔ تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ شئوں حیات کا راز داں ہو۔ عالموں، لیڈروں، موجدوں، سیاست دانوں۔ فن کاروں اور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نویسوں، مصوروں کے احوال و کوائف سے پورے طور پر واقف ہو۔ ایک مدرّس کے لئے، اس سے بڑھ کر شرم کی کیا

بات ہو سکتی ہے کہ وہ اڈیسن، لنکن، واشنگٹن، نیوٹن، نپولین، ہینڈنبرگ، کلمنشو، ولسن، ٹرورسکی، مارٹن لوتھر، کارلائل، ڈکسن سر والٹر اسکاٹ، لارڈ، کولی، صدر ہور، صدر روز ویلٹ، ریمزے میکڈانلڈ۔ مصطفےٰ کمال، اٹیلی، گاندھی، جناح، محمد علی، چرچل، ہٹلر، مسولینی وغیرہ کے ناموں اور کارناموں سے ناواقف ہو۔

ایک مدرس کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے، کہ حیاتِ خارجہ سے واقف ہو۔ اسی طرح اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے، کہ وہ حیات داخلی سے بھی پورے طور پر آشنا ہو۔ وہ اپنے ملک کے حالات سے واقف ہو۔ اس کی قدیم و جدید تاریخ سے واقف ہو۔ اس کی صنعت و زراعت سے بھی اسے واقفیت ہو۔ اس کی تجارت اور سیاست بھی اس کی نظر سے اوجھل نہ ہو۔ اس کے لیڈر، عالم، ادیب اور شعرا بھی اس کی نظر میں ہوں، تاکہ وہ اپنے تلامیذ کے افکار میں پختگی اور ہمواری پیدا کر سکے۔

حیاتِ خارجی و داخلی کے معاملات و مسائل کی طرح مدرس کو حیات علمی سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھنا چاہیے۔ اسے ہوائی اڈہ، ہوائی جہاز، سرنگ، بم، آبدوز کشتی، توپ اور گولے، کہربا اور بخار کی طاقت، علم و اختراع سے بھی کچھ نہ کچھ واقف ہونا چاہیئے۔ تاکہ اگر طلبہ میں سے کوئی اس قسم کے معاملات پر

اس سے سوال کر بیٹھے تو وہ گونگا نہ ثابت ہو۔

۸۔ مدّرس اور بحث و اطلاع

ٹریننگ کالج سے سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد ایک مدرّس یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب اس کی تعلیمی زندگی کا دور ختم ہو گیا۔ حالانکہ اُسے جاننا چاہیے۔ کہ علم کی کوئی آخری حد ہے ہی نہیں، بلکہ مدرسہ سے نکلنے کے بعد ہی طالب علم کا اصل زمانہ شروع ہوتا ہے۔ مدرسہ تو صرف راستہ کھول دیتا ہے اب رہروی خود آپ کا کام ہے۔ لہٰذا ضروری ہے۔ کہ علم اور معلومات کے حصول میں ہمیشہ آدمی لگا رہے۔ تاکہ فکر کا دروازہ بند نہ ہو۔ علم، اطلاع، بحث و تجربہ اور خورد نظر کی طرف گام فرسائی کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔

انگلستان کے مدرّس صرف اپنی کالج کی تعلیم، اور تجارب درسیہ پر اکتفا نہیں کرتے۔ سالانہ تعطیلات کے زمانہ میں ہر سال دو ہفتے یا ایک مہینے کے موسم بہار کے مدارس میں شرکت کر کے تعلیم و تربیت پر اہم لیکچر سُنتے اور اپنی معلومات بڑھاتے رہتے ہیں علم النفس میں مزید درک حاصل کرتے ہیں۔ اور غیر ملکی زبان کو سیکھ کر، ان کے لٹریچر سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ کتنا اچھا ہو، اگر معلّمین کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی کوشش کی جائے۔

مدرس اگر کتب خانوں، لائبریریوں اور عام لیکچروں سے استفادہ کا عادی ہو۔ اور مطالعۂ کتب جدیدہ کا خوگر ہو، تو بھی اُسے کافی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اور اس فائدہ سے وہ اپنے طلبہ کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

(۹) مدرس کی توجہ

مدرس کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ مدرس ہے۔ اُسے منظم، مرتب اور مہذب ہونا چاہیے، بغیر اس کے وہ کامل مدرس نہیں بن سکتا، اسے تعلیم پر قادر ہونا چاہیے۔ اپنے ادارہ کا ایک بہترین انسان بننا چاہیے۔ اپنے کام میں حکمت عملی کا خوگر ہونا چاہیے۔

(۱۰) مدرس اور روح جدید

تربیت و تعلیم کی جدید روح اور اصول سے بھی مدرس کو پورے طور پر واقف ہونا چاہیے مثلاً:-

(۱) طلبہ میں تعاون کی روح پیدا کرنا کہ وہ اپنے ساتھیوں اور اُستادوں سے تعاون کر سکیں۔

(۲) تعلیم اور عمل میں ربط پیدا کرنا چاہیے۔

(۳) خواہ مخواہ زجر و توبیخ سے کام نہ لینا چاہیے۔

(۴) تلمیذ کو اعتمادِ نفس کے جذبہ سے آشنا کرنا چاہیے۔

(۶) تلامذہ کی طبیعتوں کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔

(۷) بچوں میں تعلیم نظری و تعلیم عملی کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔ انھیں

عملی زندگی کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔ تمام چیزوں سے پہلے اسی چیز پر غور کرنا چاہیے۔

(۱۱) مدرّس اور عزیمت مدرّس کے لئے بہت ضروری ہے کہ عزم و ارادہ کا پکّا ہو۔ اس میں توازن ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ ایک دن تو کسی کام کا حکم دے، اور دوسرے دن بغیر خاص سبب کے اس سے منع کر دے۔

(۱۲) مدرّس اور تندرستی مدرس کو ہر اعتبار سے توانا اور تندرست ہونا چاہیے اس کی قوت سماعت اچھی ہو۔ اس کی آنکھیں کمزور نہ ہوں۔ اس کی آواز معتدل ہو۔ جسمی اور بدنی امراض سے وہ ملوث نہ ہو۔ کیونکہ ضعیف الجسم مدرّس ارادہ کا کمزور اور خیال کا پست ہوتا ہے۔ سریع التاثیر اور ضعیف الاعصاب ہوتا ہے اور امراض کا ہدف بنا رہتا ہے۔ وہ صحیح طور سے اپنے کام انجام نہیں دے سکتا۔

(۱۳) مدرّس کی شخصیت تمام ماہرین علم النفس و تربیت اس خیال پر متفق ہیں۔ کہ "مدرسہ اور طلبہ کی ہر چیز، صرف مدرّس کی شخصیت پر منحصر ہے" حقیقت یہ ہے کہ مدرّس کی شخصیت، بڑا اثر رکھتی ہے۔ وہ طلبہ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اور مدرسہ پر بھی۔

خلاصۂ کلام مدرس اور اس کے صفات و خصائص پر گذشتہ صفحات میں کافی بحث کی جا چکی ہے۔ اب ہم خلاصۂ کلام کے طور پر اپنی کہی ہوئی باتوں کو بطور اجمال پیش کرتے ہیں:

۱۔ مدرس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قومی شخصیت کا بارعب شخص ہو۔ تاکہ وہ اپنے طلبہ پر چھا سکے۔
۲۔ بچوں سے محبت کرتا ہو، جیسی اولاد سے کرتا ہے۔
۳۔ بچوں کی نفسیات سے واقف ہو۔
۴۔ یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ تعلیم فرد ہی کی تحسین کا نہیں سوسائٹی کا بہتری کا بھی ذریعہ ہے۔
۵۔ تمام طلبہ کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا ہو۔ امیر و غریب میں کوئی امتیاز روا نہ رکھتا ہو۔
۶۔ اپنے مقصد میں مخلص ہو۔
۷۔ زندگی اور دنیا کے معاملات و مسائل سے اس کا قریبی رشتہ قائم ہو۔ تاکہ وہ اپنے طلبہ کے سامنے کسی مسئلہ میں بند نہ ہوسکے۔
۸۔ علم سے غیر معمولی شغف رکھتا ہو۔
۹۔ فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہ نہ ہو۔ سختی کے موقع پر سختی، اور نرمی کے موقع پر نرمی کرتا ہو۔ لیکن اس کی سختی میں

قساوت نہ ہو۔ اور اس کی نرمی ضعف کے سبب نہ ہو۔
حکمت عملی سے کام کرنے کا عادی ہو۔

۱۰ ۔ تربیت جدیدہ کے اصول سے واقف ہو۔

۱۱ ۔ عزم و ارادہ کا قوی ہو۔

۱۲ ۔ توانا اور تندرست ہو۔

۱۳ ۔ حاضر جواب، صائب رائے، وسیع النظر، اور وارفع الخیال ہو

۱۴ ۔ بُرے کاموں سے مجتنب رہتا ہو۔ رکیک باتوں سے دور رہتا ہو۔ تاکہ احترام و جلال کا سزاوار بن جائے۔

۱۵ ۔ حلیم و بردبار ہو۔ کشادہ قلب ہو۔ صبر و برداشت کی قوت رکھتا ہو۔ نفس و شعور کو ضبط و نظم کا خوگر رکھ سکتا ہو۔ ذرا سی بات پر بھڑک نہ جاتا ہو۔ معمولی باتوں سے متاثر نہ ہو جاتا ہو۔

(۱۶) زبان پر پوری قوت رکھتا ہو۔ تاکہ اپنے خیال کی صفائی کے ساتھ وضاحت کر سکتا ہو۔ اور اپنا مفہوم اچھی طرح سمجھ سکتا ہو۔

(۱۷) طلبہ کو خود کام کرنے کا اہل بنانے کا جذبہ رکھتا ہو۔ ان کی صرف اسی وقت مدد کرتا ہو۔ جب وہ خود طالب امداد ہوں۔



درس کی تیاری اور اس کی اہمیت

درس کی تیاری بہت اہم مسئلہ ہے۔ مدرس کی کامیابی اور ناکامی پر اس کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ مدرسین کو اس بات سے کسی مرحلہ پر بھی غافل نہ ہونا چاہیے۔

ایک اہم بات مدرس کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنے تئیں ایک طالب علم سمجھے۔ جس دن اس حقیقت کو اس نے نظر سے اوجھل کر دیا۔ اس کی عزت و بزرگی کا ستون اسی دن گر پڑے گا۔ ہم اگر یہ کہیں تو ذرا بھی مبالغہ سے کام نہیں لیں گے کہ معلّم کی عظمت کا راز، اپنے کورس کی تیاری اور کثرتِ مطالعہ میں مضمر ہے۔ جب تک وہ زندہ ہے علم

کی طلب سے باز نہ آئے۔ زندگی بھر علم کی کھوج میں لگا رہے۔ بحث و اطلاع سے کبھی نہ چوکے۔ ہمیشہ اسی دھن میں مست رہے۔ یہ جو کہاوت ہے کہ "مدرّس مہد سے لے کر لحد تک طالب علم رہتا ہے!" بالکل صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے۔

ایک مثال

ڈاکٹر آرنلڈ سے ایک دفعہ سوال کیا گیا۔ تعلیم دینے سے پہلے، آپ ہر روز، اسباق کا مطالعہ کیوں کرتے ہیں؟" ڈاکٹر آرنلڈ نے وہ جواب دیا، جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ انھوں نے کہا "میں چاہتا ہوں، میرے شاگرد ہر روز نئے چشمے کا تازہ پانی پئیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ سڑا اور رکا ہوا پانی پئیں" ان الفاظ سے ڈاکٹر آرنلڈ کا مطلب یہ تھا، کہ ہر روز سبق کی تیاری سے نئے نئے شگوفے کھلیں، تاکہ درس میں حیات و نشاط پیدا ہو۔ موت اور خمول کی کار فرمائی نہ ہو۔ تاکہ اسباق کا زندگی سے سررشتہ قائم رہے، منقطع نہ ہونے پائے، جمود اور فساد سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو

انسان خطا و نسیاں کا پتلا ہے، جس طرح ایک عام آدمی بھولتا، چوکتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک مدرس بھی بھول چوک سکتا ہے۔ لیکن اگر ہر روز وہ اپنے نصاب کا مطالعہ، اور اس کے درس کی تیاری کرتا رہے، تو نہ صرف یہ کہ اس سے غلطی کا احتمال نہیں رہتا، بلکہ اس کی تعلیم اور زیادہ قوت

حاصل کر لیتی ہے۔

مدرس کو صرف درس کی تیاری اور مطالعہ ہی پر اکتفا نہیں کر لینا چاہئے، اسے یہ بھی سوچنا چاہئے کہ وہ اپنا علم، اپنے طلبہ کے سامنے کس انداز اور اسلوب سے پیش کرے، کہ ان کے دل میں بات بیٹھ جائے، اور وہ پورے طور پر اس کا مفہوم سمجھ لیں۔

مدرس کو اس پر بھی اکتفا نہیں کرنا چاہئے کہ جو کچھ کتاب میں ہے، وہ اس کے ذہن و حافظہ پر نقش ہے۔ اور وہ اپنے طلبہ کے سامنے طوطے کی طرح جاکر سارا سبق رٹ لے گا۔ یہ طریقہ نہ اخلاق پر مبنی ہے، نہ دیانت و امانت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔

علم اور تعلیم

یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ علم حاصل کرنے کا زمانہ تعلیمی دور اور نصاب ختم کر لینے کے بعد ہی آتا ہے۔ علم میں اضافہ بحث و تکرار ہی سے ہوتا ہے۔ وہ علم جسے کوئی نہ سنے، جس سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے وہ سوائے نقص و نسیان کے کچھ پیدا نہیں کر سکتا۔ ایک ماہر تعلیم کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم کو با برکت بناتا ہے۔ اس لئے با برکت بناتا ہے کہ وہ علم سیکھتا اور اسے قبول کرتا ہے۔ ایک یہودی ماہر تربیت و تعلیم کا بیان ہے کہ "میں نے اپنے اُستاددں

سے بہت کچھ سیکھا لیکن اپنے ساتھیوں سے اُستادوں سے بھی
زیادہ سیکھا۔ اور اپنے شاگردوں سے سب سے زیادہ سیکھا!"
سچ پوچھئے تو اس قول میں ذرا بھی غرابت نہیں ہے۔ ایک
ذہین طالب علم کبھی کبھی ایسے نکتے تک پہنچ جاتا ہے، جہاں
تک اُستاد کی نظر بھی نہیں پہونچتی۔ سرگرم اور شوقین طلبہ اپنے
عمل سے استاد میں بھی علمی سرگرمی کا جذبہ پیدا کر دیتے ہیں۔ اس
طرح وہ خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، اور اُستاد کو بھی فائدہ
پہنچاتے ہیں۔

ایک طالب علم درس کی جو تیاری کرتا ہے، مدرس کی تیاری
اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ طالب علم کی
تیاری محدود اور سطحی ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنے درس کی تیاری
کرتا ہے۔ وہ بھی معمولی طور پر۔ لیکن مدرس اس طرح نہیں کر سکتا
اسے عمیق نظر سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اور درس کے
متفرقات اور اس کے مختلف پہلوؤں پر گہری نگاہ رکھنی پڑتی
ہے تاکہ وہ جو علم پیش کرے، وہ اس سے زیادہ ہو۔ جو طلبہ نے
بطور خود اپنے مطالعہ اور تیاری سے حاصل کر لیا ہے۔

درس کی تیاری کے وقت مدرس کو ان کلمات اور الفاظ
کے معنی بھی یاد رکھنے چاہئیں جو سخت ہوں۔ وہ عبارت کے ہر فقرہ
اور جملہ کا مفہوم اچھی طرح سمجھتا ہو۔ اور سمجھا سکتا ہو۔

وہ منطق اور سنجیدہ فکر و ترکیب کی وضاحت کرنے پر قادر ہو۔ ہر قال کی آسان انداز میں تعبیر کر سکتا ہو۔ وہ ضرورت کے مطابق درس میں حذف و اضافہ سے بھی کام لے سکتا ہو۔

چند مبادیات

درس کی تیاری کے سلسلہ میں معلّم کو مبادیات ذیل کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے۔

(۱) مدّرس کو صرف آج کے درس ہی پر نظر نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ کل جو پڑھا چکا ہے اور کل جو پڑھائے گا، اس پر بھی اس کی نظر ہونی چاہیئے۔

(۲) سال تعلیم کے شروع میں مدرس کو اپنا پورا سال بھر کا پروگرام اور نصاب اپنی نظر کے سامنے رکھ لینا چاہیئے ہر ہر سبق کا ایک اصول معیّن کرے۔ کس طرح پڑھائے گا؟ کن مسائل پر زیادہ زور دے گا؟ کن مسائل پر یوں ہی سرسری گذر جائے گا؟ پیچیدہ عبارتوں کی توضیح کس طرح کرے گا؟ مشکل الفاظ کے معنی کس طرح بتلائے گا؟ عبارت اور اسلوب میں تطبیق کیوں کرے گا؟

(۳) مدرس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں سے ہر ایک کی ذہنی، دماغی اور جسمی اہلیت پیش نظر رکھے۔ غبی اور ذہین کو پہچانتا ہو۔ یہ سمجھتا ہو کہ ایک ہی درس کا یہ حصہ وہ فلاں طالب علم کو کس طرح سمجھائے گا، اور فلاں تلمیذ کے کس طرح

ذہن نشین کرے گا۔

(۴) اُن وسائل سے بھی مدرس کو مسلح ہونا چاہئے، جن سے کام لے کر وہ آسانی کے ساتھ، اپنے طلبہ کو اپنا مفہوم ذہن نشین کرا سکتا ہے، یا جن سے درس کی توضیح میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً تصویریں، مثالیں، نمونے وغیرہ۔

(۵) سابق طلبہ کے معلومات سے بھی، مدرس کو فائدہ اٹھانا چاہئے تاکہ قدیم و جدید کا ربط قائم رہے۔

(۶) مدرس کو اپنے کورس کے انتخاب میں حسن انتخاب سے کام لینا چاہئے، جو اس کے اور تلامیذ کے فہم و ذوق سے پوری پوری مطابقت رکھتا ہو۔

(۷) مختلف اسباق کے درمیان مشابہت اور اختلاف کی جو صورتیں پیدا ہوتی ہیں، مدرس کی ان کے اسباب و وجوہ پر بھی نظر ثانی چاہئے۔ اسی توضیح و تشریح پر نقطہ درس کی وضاحت کا انحصار ہوتا ہے۔

(۸) مدرس کو اپنے کورس پر پوری طرح غالب اور متصرف ہونا چاہئے۔

(۹) درس کی تجدید و تعیین بھی مدرس کو پیش نظر رکھنی چاہئے۔

(۱۰) مدرسہ کی لائبریری پر بھی مدرس کی وسیع نظر ہونی چاہیے اسے معلوم ہونا چاہئے۔ اس کے کورس سے متعلق کون سی

کتابیں لائبریری میں موجود ہیں۔ تاکہ بوقت ضرورت وہ اپنے طلبہ کو ان کتب کی مراجعت پر آمادہ کر سکے۔ اور درس کے بعد وہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

(۱۱) اسباب کا زندگی سے، اور زندگی کے حالات و مسائل سے پورا رشتہ قائم رہنا چاہیے۔ مثلاً پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران میں مدرس بڑی آسانی سے طلبہ کو وطنیت کا درس بھی دے سکتا ہے اور انتخابی زندگی کے پہلو بھی ان کے سامنے اُجاگر کر سکتا ہے۔ یا اگر جنگ کا زمانہ ہو تو وہ اپنے طلبہ کو بموں سے بچنے اور ذاتی و اجتماعی حفاظت کے گُر بھی بتا سکتا ہے، اور ان کا جذبۂ مدافعت وطن قومی سے قوی تر کر سکتا ہے۔

(۱۲) مدرس کو یہ پہلے سے سوچ لینا چاہیے کہ وہ اپنا درس کس انداز و اسلوب پر شروع کرے گا۔

تیاری کے فوائد

صفحاتِ بالا میں، ہم تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ مدرس کے لیے اپنے درس کی تیاری کتنی ضروری اور اہم ہے۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس تیاری سے کیسے اچھے اور بیش بہا فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) اگر مدرس اپنے نصاب پر حاوی ہے اور درس پوری تیاری

کے ساتھ دیتا ہے تو اپنے درجہ کو ضبط و نظم کا خوگر بنانے
میں اسے ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ طلبہ اگر مدرس
کو درس میں کمزور پاتے ہیں۔ تب ہی وہ اسے خیال میں نہیں
لاتے، اور درجہ کا ضبط و نظم درہم برہم کر دیتے ہیں۔ ورنہ نہیں
اگر مدرس اپنے فن میں کامل ہے اور درس کی پوری تیاری
کر کے درجہ میں آتا ہے تو بغیر تعزیر و عقوبت کے طلبہ اس
سے ڈریں گے اور اس کے اشارے پر چلیں گے۔ شریر لڑکوں
کو شرارت سے روکنے کے لئے اس کی ایک نظر کافی ہے۔

(۲) اگر مدرس اپنے طلبہ کی مقدار فہم سے واقف ہے، اور وہ
اپنی تیاری سے فائدہ اٹھا کر انہیں پورا فائدہ پہنچاتا ہے، تو
وہ تلامذہ کے درمیان اس طرح بیٹھے گا، جیسے مریدوں کے
مجمع میں پیر۔ وہ حوصلہ افزائی بھی کرے گا، اور غافل کو ہشیاری
کا درس بھی دے گا۔ ضعیف کی مدد کرے گا، اور کاہل کو
آمادۂ عمل کرے گا۔

(۳) اگر مدرس ہر وقت درس کیلئے تیار ہے اور اس کی تیاری مکمل ہے، تو
طلبہ اس سے محبت کرینگے اور وہ اخلاص عمل کی ایک بہترین مثال بن جائیگا
باگلے کا قول ہے: معلم کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ہر سبق کی مکمل تیاری
کرلے تب درجہ میں جائے۔" یہ قول بالکل واقفیت پر مبنی ہے۔ اس اصول
پر عمل کرنے کے بعد کوئی دشواری بھی باقی نہیں رہ جاتی۔

(۴۱)

تدریس کے بنیادی قواعد

اب ہم تدریس و تعلیم کے چند بنیادی اور اہم قواعد و ضوابط پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ایک خاص بات اس جگہ ہم یہ بات صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم مدرّس کو کوئی حکم دے کر اسے کسی خاص وضع و اسلوب کی حدیں جکڑنا نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ ہر انسان کا خود اپنا ایک طرز و اسلوب ہوتا ہے، اور اس میں مداخلت مناسب نہیں۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ہر درس کا ایک خاص اصول اور ضابطہ ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کچھ قوانین عامہ بھی اس سلسلہ میں موجود ہیں۔ اور ان سے استفادہ بہر حال ضروری ہے ہم ان لوگوں

میں بھی نہیں ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ماضی میں ماہرین تربیت و تعلیم نے جو اصول و قواعد مرتب کئے تھے وہ تمام کے تمام رائیگاں اور بیکار ہیں۔ کام کی باتیں ان میں بھی مل سکتی ہیں اور ان سے بھی ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس وقت تک اس سلسلہ میں جو قواعد مرتب اور منضبط ہوئے ہیں۔ وہ بھی حرف آخر کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھے جا چکے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو زیر تجربہ ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کی خطا و صواب کا ابھی اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔ اور ایسے قواعد بھی ہیں جو تا آں منضبط نہیں کئے جا سکے ہیں۔

اب ذیل میں ہم چند ایسے اصول درج کرتے ہیں جو ہر کورس اور اس درس میں فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں۔

(۱) غرض کی تجدید

مدرس کے سامنے درس دیتے وقت ایک خاص غرض ہونی چاہیئے، جس کا حصول سرگرمیٔ کار کا محرک ہو۔ اور یہ غرض و مقصد تلمیذ کے سامنے بھی ہمیشہ رہنا چاہیئے۔ تاکہ وہ صحیح معنی میں معلم سے تعاون کر سکے۔ اور اس معین غرض کے حصول کی جد و جہد کر سکے اگر ایک مخصوص مقصد پیش نظر نہیں ہوگا۔ تو نہ مدرس کامیاب ہوگا، نہ تلمیذ کے اندر لگن اور امنگ پیدا ہوگی۔

(۲) ایک اور اصول

مدرس کا فرض ہے کہ وہ اپنے درس

کا کام خوبی کے ساتھ شروع کرے۔ منطقی ترتیب پیش نظر رکھے، اور ان اصولوں کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دے۔ جنہیں دوران درس میں بروئے کار لائے گا۔ طلبہ کی ایسی تقسیم کرے کہ کمزور طلبہ ایک طرف، ذہین ایک طرف۔ لیکن یہ تقسیم اس طرح ہو کہ خود طلبہ اسے محسوس نہ کر سکیں۔ ورنہ ذہین طالب علم اپنی ذہانت پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے لگے گا۔ اور کمزور میں بے حوصلگی پیدا ہو جائے گی۔

(۳) قانون ربط

مدرس کو قانون ربط سے بھی پورا فائدہ اٹھانا چاہیۓ۔ یعنی اسے جدید معلومات کو قدیم معلومات و تجارت سے مربوط اور مسلسل رکھنا چاہیئے۔ اگر مدرس نے اس اصول کو نظر انداز کر دیا تو وہ اپنے مقصد میں مشکل سے کامیاب ہو سکے گا۔

مدرس کو بچہ کے احوال و افکار کی رعایت بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے اس سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کرنا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو۔

امریکہ کے ایک مدرسہ میں، ایک اُستانی نے ایک لڑکے کو کتاب کے کچھ شعر پڑھنے کی ہدایت کی، ان اشعار میں لڑکا ایک بڑھئی سے کہتا ہے "یہ درخت نہ کاٹ" اور اس درخواست کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ "اس کے سایہ میں ہم بھائی بہن کھیلا کرتے تھے۔ یہیں میری ماں پیار کیا کرتی تھی" لڑکے

نے یہ اشعار پڑھنے سے انکار کردیا، اور خاموش بیٹھ گیا۔ اُستانی نے اسے مجبور کیا کہ وہ پڑھے۔ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں مجبوراً پڑھنے لگا، پھر گر پڑا، اور رونے لگا۔ اُستانی گھبرا گئی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ یہاں تک کہ اُسے ایک دوسرے طالب علم نے بتایا کہ اس لڑکے کی ماں ابھی حال میں مری ہے اگر استانی کو اپنے شاگرد کا حال معلوم ہوتا تو وہ ضرور اس کے احساس و شعور کی رعایت رکھتی۔ اور اسے تکلیف نہ دیتی، جو بے مقصد تھی۔

(۴) قانون انتباہ تدریس کے بنیادی اصول وضوابط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ طالب علم میں تشویش پیدا کی جائے۔ تاکہ وہ درس کی طرف پورے طور سے متوجہ ہو سکے۔ اپنے وقت سے فائدہ اٹھائے، اور اپنے اندر تازگی پیدا کرے۔ تشویش سے طالب علم کے شعور اور انتباہ میں اضافہ ہوتا ہے اور پختگی پیدا ہوتی ہے، اگر طالب علم کی انتباہی قوت کمزور ہو تو مدرس اسے کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اگر وہ سختی اور درشتی سے کام لے گا، تو اس سے بھی کچھ زیادہ کام نہیں چلے گا۔ درجہ اُتار دے تو بھی بے نتیجہ۔ یاد رہے شوق و جبر میں بہت فرق ہے۔ طالب علم اگر شوقین ہے تو وہ بہت کچھ حاصل کرلے گا۔ اور اگر اسے مجبور کیا جائے تو وہ کچھ بھی نہیں

حاصل کر سکے گا۔

طالب علم میں اگر تشویش و انتباہ کا جذبہ پیدا کر دیا جائے تو اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ اور وہ لڑکا جو درس سے کوسوں بھاگتا ہے اور علم سے نفرت کرتا ہے بڑا محنتی اور شوقین بن جاتا ہے۔ لیکن ہر حالت میں اُستاد کا ماہر ہونا ضروری ہے، رغبت اور شوق دونوں سودمند ہیں۔ لیکن شوق فطری اور طبعی چیز ہے اور رغبت خارجی چیز۔ شوق پیدا ہوتا ہے اور رغبت پیدا کی جاتی ہے۔

(۵) ادراک و حواس سے استفادہ

علمائے علم النفس کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عقل اسی چیز کو قبول کرتی ہے جو حواس میں پہلے سے موجود ہو لہٰذا حواس کی تربیت در اصل عقل کی تربیت ہے۔ مشہور انگریزی شاعر ملٹن نے اسے اگر "معرفتہ خمسہ" کا دروازہ قرار دیا ہے تو ذرا بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ ماہرین تعلیم و تربیت حواس کی تربیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ پیمانے، اوزان، موسیقی نقاشی، کتابت، جغرافیہ اور دستی اشغال میں، حواس کا بہت بڑا بلکہ بغیر حواس کی تربیت کے یہ فنون حاصل ہی نہیں ہو سکتے۔ ہاتھ اور حواس بچہ کے معلم اول یہی ہیں۔ روسو کہتا ہے "ہمارے ہاتھ پاؤں، آنکھ، یہی چیزیں ہیں جو ہمیں فلسفہ سکھاتی ہیں!"

پستالوزی، فروبل اور اسپنسر نے بھی تربیت حواس پر بہت زور دیا ہے۔

سچ پوچھئے تو حواس عقل کی کنجی ہے۔ حواس اگر درست ہیں تو انسان کی عقل بھی مکمل ہے۔ مدرس کا کام یہ ہے کہ وہ روشندانوں کو کھول دے، جو براہِ راست عقل سے تعلق رکھتے ہیں۔ روسو نے جو رہنمائی کی ہے، اسی کو پیش نظر رکھ کر تعلیم و تربیت کے نئے نئے حلقے (مانٹسوری سسٹم وغیرہ) عالم وجود میں آئے ہیں۔ اور ایک موقع پر روسو نے کہا ہے "حواس کی تربیت کا مقصد ان کا مجرد استعمال نہیں ہے"۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ تربیت حواس کا مقصد ہے، معرفت تک پہنچنا، صحیح حکم لگانا، قوت شعور کو بیدار کرنا، ادراک و نظر کی قوت پیدا کرنا۔

(۶) افکار کی تعبیر

افکار ہی سے استعمال پیدا ہوتے ہیں اگر تلامذہ کے نفوس میں فکر صحیح پیدا ہو چکی ہے تو خیال اور جذبہ کی تعبیر و تفسیر وہ بڑی آسانی اور وضاحت کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح نقش و تصویر، عمل و اشارہ کی پرکھ بھی ان میں بدرجۂ اولیٰ پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر وہ یادداشت کی تحریروں کی، تصویروں کی، نقوش کی، کام کی، صحیح تعبیر کرنے پر قادر ہیں، تو مقصد حاصل ہو گیا۔ اس لئے کہ تعبیر صحیح ہی ان کے نفوس میں فکر صحیح پیدا کر سکتی ہے۔

ان باتوں سے واضح ہو گیا کہ طلبہ کو جو نقاشی اور مصوری وغیرہ سکھائی جاتی ہے، اس کی اصل غرض و غایت یہ نہیں ہوتی کہ انہیں بہت بڑا نقاش یا مصوّر، یا فن کار بنا دیا جائے۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ پیش آمدہ افکار کی صحیح تعبیر و وضاحت کر سکیں۔

(۷) نشاطِ ذاتی تلمیذ کا کافی وقت خالی ملنا چاہیئے۔ جسے وہ نشاط و سرگرمی کے ساتھ اپنے ذاتی تجارت کے سلسلے میں صرف کر سکے۔ بار بار مشق کرے، اور کسی صحیح نتیجہ پر پہنچے۔ مشق، مہارت عمل کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ بچّہ کے اعضا بھی مشق ہی سے بڑھتے اور نمو حاصل کرتے ہیں۔ بغیر مشق کے وہ ضعیف اور سست پڑ جاتے ہیں۔ اگر تلمیذ اپنے نفس پر اعتماد کرے اور تفکیر کو فروغ دے تو اس کی علمی قوت لامحالہ بڑھ جائے گی۔

بچوں میں نشاط اور چستی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہوتی۔ وہ فطرتاً حرکت اور عمل کو پسند کرتے ہیں سکون اور کسل سے نفرت کرتے ہیں بشرطیکہ ان کی صحت اچھی ہے۔ ضروری ہے کہ بچوں میں نشاط اور چستی کو بروئے کار لانے کی پوری جد و جہد کی جائے۔ اور انہیں موقع دیا جائے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

روسو کہتا ہے کہ تعلیم میں اعتماد نفس، ابتکار اور اختراع کا

موجب بنتا ہے۔ بچّہ میں کسی کاپی سے نقل کرنے کی عادت نہیں پڑنی چاہیئے۔ بلکہ اس میں خود فکر و عمل کی اسپرٹ ہونی چاہیئے۔ مدرس کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تعلیم کثرت تکلّم کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ مدرس کی رہنمائی میں خود طلبہ اپنے ذہن و فکر کی مدد سے گتھیاں حل کریں۔ اور اپنا کام بلا مدد غیرے کرنے کی عادت ڈالیں۔ انہیں مدد صرف اُس وقت دی جائے جب وہ حقیقتاً اس کے محتاج ہوں۔

(۸) قانون استقرا و استنباط

چھوٹے بچوں کے لیے طریقۂ استقرائی بہت موزوں اور مناسب ہوتا ہے اس طرح کہ مدرس جزئیات سے کلیات تک مثالیں دیتا ہوا رفتہ رفتہ پہنچے۔ ساتھ ہی ساتھ تجارت تعریف اور قاعدہ و حکم کی مزاولت بھی رہے۔ طلبہ کو اختلاف و اعتراض کی پوری اجازت ہونی چاہیئے، تاکہ وہ خود استنباط و استخراج کر کے مقصود بالذات قاعدہ تک رسائی حاصل کر سکیں۔

بڑے طلبہ کیلئے قیاسی طریقہ زیادہ مفید اور مناسب ہوتا ہے اور وہ تطبیق اور امثلہ قاعدہ یاد ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بڑی غلطی ہو گی۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ہر کورس اور نصاب، استقراء و استنباط سے کام لے کر مکمل کرایا جا سکتا ہے۔ بعض ایسے اسباق بھی ہیں جو استقراء کے قطعاً محتاج نہیں ہیں۔ جیسے نقاشی

مصوری، موسیقی وغیرہ۔ یہ صرف مشاہدہ اور تجربہ کے محتاج ہوتے ہیں۔

بچہ کا استقرا مکمل نہیں ہوتا۔ نہ قوانین عامہ کا ادراک مکمل ہوتا ہے۔ شروع میں اس کا ادراک بالکل ناقص ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ آرا اور تجارت کے ساتھ ادراک تکمیل پاتا ہے اور استقرا مکمل ہو جاتا ہے۔ اور حاصل شدہ آرا و افکار و نظریات سے انتفاع کامل ممکن ہو جاتا ہے۔ استقرا سے ہم حقائق عامہ تک پہنچتے ہیں۔ قیاس سے توضیح کا کام لیتے ہیں۔ برہان سے تصحیح کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مسئلہ تلامیذ کے اذہان میں رچ جاتا ہے

قانون قیاس جب تلامیذ قاعدہ عامہ سے طریقۂ استقرائیہ کے سہارے واقف ہو جائیں تو اس کی توضیح اور اذہان میں تثبیت طریقۂ قیاسیہ کی مدد سے ممکن ہے استقرا کا مقصد ہے افکار، تعریفات احکام اور قواعد عامہ کی مدد سے عقل میں اضافہ اور قیاس کا مقصد ہے۔ افکار، تعریفات احکام اور قواعد علیہ سے پورا پورا انتفاع، نیز ان دونوں کے درمیان تطبیق۔ تاکہ تلامذہ کے ذہن و دماغ میں وہ بات اچھی طرح جم جائے

اطفال جب یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے جو قواعد و نظریات حاصل کئے ہیں۔ ان سے انتفاع پر وہ پورے طور پر قادر ہیں۔ تو بہت مسرور ہوتے ہیں۔

ایک مثال سُنیئے۔ دو ڈھائی سال کے ایک بچّے نے پنجرے میں ایک چیتا دیکھا، تالیاں بجا کر باپ سے کہنے لگا: "ابّا، ابّا، دیکھنا کتنی بڑی بلّی!" اس کی یہ فکر طریقۂ قیاسیہ کا نتیجہ تھی کہ چیتے کو بلی پر قیاس کر لیا۔ اس لئے کہ ان دونوں میں کافی مشابہت ہوتی ہے مدرس کا فرض ہے، کہ بچہ کے اس میل اور رجحان تو ترقی دے یہاں تک کہ بچّے کے آرا اور تجارت مکمل ہو جائیں ان میں کوئی نقص باقی نہ رہ جائے۔

کسب معلومات کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ ذہن کو معلومات کا خزانہ بنا دیا جائے۔ یہ ہے کہ تلمیذ پڑھنے لکھنے میں، اور اپنے عمل میں ان سے پورا اور صحیح فائدہ اٹھا سکے۔ یہاں تک کہ عالم سے عمل کا فائدہ نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں، وہ بیکار مرض ہے۔ امریکہ کے مشہور ماہر علم النفس و تربیت جان ڈیوی کا قول ہے۔ تربیت کا مقصد، زندگی کے لئے تیاری کرنا نہیں ہے۔ بلکہ تربیت بجائے خود زندگی ہے!"

علم و عمل میں کافی فرق ہے، اور ایک دوسرے میں تناقض بھی ہے۔ ہم بہت سی چیزیں جانتے ہیں لیکن عملاً ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ہم بہت سے ایسے کام کرتے ہیں، جن کا نتیجہ ہمیں نہیں معلوم، جن کی افادیت سے ہم بے بہرہ ہیں، اور یاد رکھنا چاہیئے انسانی زندگی کا سب سے بڑا عیب یہی ہے۔ کسی شخص کا اخلاق

جانچنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ روزمرہ کی زندگی میں اس کے اعمال کا کیا حال ہے؟ اگر وہ اس کے اقوال سے ہم آہنگ ہیں تو وہ اچھا ہے اور اگر اقوال اور اعمال میں فرق ہے۔ تو وہ منافق ہے جو کہتے ہیں کچھ کرتے ہیں کچھ۔ جو کچھ کرتے ہیں وہ کہتے نہیں جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔

قانون عادت تدریس کے بنیادی قوانین میں، قانون عادت کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ عادت سے مراد ہے، تکوین عادت۔ یعنی ایسی عادت پیدا کرنا کہ وہ عمل بن جائے۔ مدرسہ تکوین عادات میں ہرگز تن تنہا کامیاب نہیں ہو سکتا جب مدرسین اور معلمین بھی اس باب میں اس سے پورا پورا تعاون نہ کریں۔

علم اور عمل علم اور عمل میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک دوسرے سے الگ ہوا اور بیکار ہوا۔ بیسویں صدی کے جدید قواعد تربیت و تعلیم اسی اصول پر مبنی ہیں۔ یہ وہ اصول ہے جس کی طرف روسو بہت پہلے اشارہ کر چکا ہے۔

اس اصول کا مبدا یہ ہے کہ تلمیذ کو اعتمادِ نفس کا عادی بنا دیا جائے کہ وہ خود اپنے عمل سے علم اور علم سے عمل حاصل کرے۔ انسان کو افکار و آراء میں دوسروں کا غلام نہیں ہونا چاہیے۔ حقیقت کی معرفت، اور حقیقت تک پہنچنے میں خود اپنی عقل

سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اپنی قوت فکریہ کو معطل نہیں کر دینا چاہیئے۔ بلکہ اس سے کام لینا چاہیئے۔

تلمیذ اور اُستاد

اُستاد کو شاگرد کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ یہ بڑی پرانی حقیقت ہے اور جدید اصول تربیت بھی اس کی اہمیت پورے طور پر محسوس کرتا ہے۔ فروبل نے بہت عرصہ پہلے یہی بات کہی تھی، اور آج کے ماہرین علم النفس و تربیت بھی یہی کہہ رہے ہیں۔

ڈاکٹر برٹرینڈ رسل کا قول ہے: "معلم اس وقت تک معلم نہیں کہلا یا جا سکتا، جب تک کھیت میں اپنے شاگرد کے ساتھ گائے کا دودھ دوہنے پر تیار نہ ہو۔ جب تک وہ اس کے ساتھ رہتا نہ ہو۔ جب تک وہ اس کی سوسائٹی کا ایک فرد نہ ہو۔ جب تک وہ اس کی فطرت، اور نفسیت سے واقف نہ ہو۔ جب تک وہ یہ نہ جانتا ہو کہ اسے کیا مرغوب ہے اور کیا نامرغوب؟ بغیر اس کے وہ اسے پورا پورا فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ نہ اس کی فکر کو اونچا کر سکتا ہے۔ نہ اس کے عمل و علم میں اضافہ نہ کر سکتا ہے۔ نہ اسے آئندہ زندگی کے لئے تیار کر سکتا ہے۔

مدرسہ کا مقصد

بچے مدرسے کیوں بھیجے جاتے ہیں؟ اس لئے نہیں کہ وہ زندگی کے لئے تیاری کریں، اس لئے اور صرف اس لئے کہ زندہ رہیں اور زندہ رہ سکیں

کل فروبل نے یہی بات کہی تھی ۔ اور آج جان ڈیوی صاحب یہی
فرما رہے ہیں ۔ جان ڈیوی کا قول ہے ۔

"تربیت زندگی کی تیاری کا نام نہیں ہے بلکہ وہ خود
مستقل زندگی ہے"

لہذا ہم مدرس سے توقع کرتے ہیں کہ اس کے اسباق زندگی
بخش ہوں گے ۔ یہ اسباق زندگی سے متصل ہوں ۔ وہ انہیں
زندگی کے لئے بعد میں تیار کرے گا ۔ پہلے ان میں زندگی کی رش
پیدا کرے گا ۔ مدرسہ کے اندر بھی، اور باہر بھی ۔

بچہ کی فطرت

مدرس کے لئے یہ بھی بسا ضروری ہے کہ وہ
بچہ کی فطرت میلانات درجحانات اور
ان پر نظر رکھنے ۔ فروبل اور روسو نے اس اصول پر بہت زور دیا ہی

مختصر اسباق

درس کی طوالت فائدہ کے بجائے نقصان کی
موجب ہوتی ہے ۔ بالخصوص جب کہ تلمیذ کم عمر
اور ناسمجھ ہوں ۔ اس لئے کہ وہ زیادہ عرصے تک ایک ہی نقطہ پر اپنی
توجہ مرکوز نہیں رکھ سکتے ۔ اسباق اگر مختصر ہوں، اور ان میں اگر
کچھ تنوع بھی ہو تو بچے دلچسپی کے ساتھ آخر وقت تک بیٹھے
رہیں گے، اور پورا پورا فائدہ درس سے اٹھائیں گے ۔ ان میں عمل
کی طرف رغبت پیدا ہوگی ۔

(۴۲)

تدریس کے عام طریقے

اب ہم تدریس کے عام طریقوں پر گفتگو کریں گے.

طریق تدریس اور اس کی اہمیت

درس کے سلسلے میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ طلبا کو سبق دیا کیوں کر جائے؟ اسی پر مدرس کی کامیابی، اور طلبہ کی کامرانی، اور مدرسہ کی نیک نامی کا انحصار ہے۔ سوچنے کی چیز یہ ہے کہ ہم کون سا طریقہ اختیار کریں کہ جو سبق چاہیں وہ گھول کر طلبا کو پلا دیں، اور جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں، وہ ان کے ذہن و دماغ میں رچ اور بس جائے.

اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قبل اس کے کہ معلّم اپنے کلاس میں داخل ہو۔ اسے اپنے ذہن

بیں دینے والے سبق کا ایک نقشہ تیار کر لینا چاہیئے۔ کہ مجھے یہ پڑھانا ہے۔ اور اس طرح پڑھانا ہے۔ پھر کلاس میں جاکر اپنے طے شدہ پروگرام پر سختی سے عمل کرنا چاہیئے۔ طریق تدریس یا تعلیم پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ نتیجہ کی اچھائی اور برائی کا تمام تر اسی پر مدار ہوتا ہے۔ صرف مدرسہ ہی کا نہیں، مدرس کی کامیابی اور ناکامی بھی اسی چیز پر منحصر ہوتی ہے۔ بہت سے ایسے معلم ہوتے ہیں کہ اپنے فن میں یکتا ہوتے ہیں۔ لیکن طریق تدریس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے علم سے وہ اپنے تلامذہ کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا سکے۔ وہ ایسا اسلوب اور طرز نہیں جانتے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں، وہ براہ راست طلبہ کے ذہن و عقل کو متاثر کرے۔

مدرس کا فرض ہے کہ سب سے زیادہ جس پر وہ زور دے وہ یہی طریقۂ تدریس ہے، تاکہ وہ بھی نیک نام اور سرخ رو ہو۔ اور اس کے طلبا بھی کامیاب و کامگار ہوں اور مدرس کی شہرت پر بھی حرف نہ آئے جس طرح ہم مدرس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے فن میں ماہر ہوگا۔ اسی طرح ہم اس سے یہ اُمید بھی رکھتے ہیں کہ وہ طریق تدریس کا عالم ہوگا۔ اور اپنے طلبہ کو گمراہ نہ ہونے دے گا۔

تدریس کے شروط

قبل اس کے ہم تدریس کے طریقوں کی

اصل اور یہ تک پہنچیں، ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کو بھی
نظر انداز نہ ہونے دیں کہ ہمیں طفل کی نفسیات اور عقل کا
جائزہ لینے کا طریقہ بھی معلوم ہونا چاہیئے۔ جب تک ہم وبچہ
کی نفسیت اور عقلیت سے پورے طور پر واقف نہیں ہونگے
ہرگز اس کے کام نہیں آ سکتے۔ نہ اُسے فائدہ پہنچا سکتے ہیں
ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کس طرح کام کرتا ہے؟ کیونکر
سوچتا ہے؟ محسوس کس طرح کرتا ہے؟ تصور کس طرح قائم
کرتا ہے؟ خیال و ادراک کی دنیا میں کیونکر پہنچتا ہے؟ اور
وہاں کیا کرتا ہے؟ یادداشت کا کیا عالم ہے؟ اور سہو ونسیان
کی کیا کیفیت ہے؟ جب تک یہ بنیادی چیزیں ہمیں نہ معلوم ہوں
ہم کوئی صحیح اور کارگر طریق تدریس وضع نہیں کر سکتے۔ اور نہ
کامیاب طور پر اسے بروئے کار لا سکتے ہیں۔

قدیم اسلوب

قدیم طریقہ بالکل لغو اور مہمل تھا۔ مدرس
اسی طرح پڑھاتا تھا جس طرح خود اس نے
پڑھا تھا۔ یا جس طرح اسے پڑھایا گیا تھا۔ اُس زمانہ میں ساری
توجہ نصاب اور کورس پر مبذول رہتی تھی۔ صرف نصاب اور
کورس کی طرف۔ کسی اور طرف بالکل نہیں۔ لیکن عصر جدید میں
بلاشبہ نصاب اور کورس کی طرف بھی توجہ کی جاتی ہے۔ مگر اس
سے زیادہ خود طفل، اس کی جبلت اور نفسیت پر بھی توجہ مرکوز کی جاتی

ہے ۔ قدیم وجدید کا یہی فرق ہے اور بہت بڑا فرق ہے ۔ اگر ہم بچہ کی نفسیت اور عقلیت سے واقف نہ ہوں، تو ہرگز صحیح طرز پر اسے درس نہیں دے سکتے ۔ صرف اسی طرح وہ اپنے نصاب کو ہضم کر سکتا ہے اور درس کی طرف راغب اور مائل ہو سکتا ہے اور اس کے ذوق و شوق سے ہم فائدہ اُٹھا سکتے ہیں ۔

قدیم طرز تدریس میں ایک اور بھی بہت بڑی خامی تھی یہ کہ کلاس میں سب لڑکوں کو ایک ہی طرح پڑھایا جاتا تھا ۔ اس پر قطعاً غور نہیں کیا جاتا تھا کہ ان طلبا میں قوی کون ہے، اور ضعیف کون، ذہین کون ہے اور غبی کون ؟ لیکن عہد حاضر میں اس فرق کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے اور مدرس اپنے درس میں اس فرق کی پوری رعایت کرتا ہے ۔ اور اس طرح ہر طالب علم اپنی استعداد، صلاحیت، اہلیت اور ظرف کے مطابق درس سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔

درس کے ساتھ ہی طریق درس بھی بدل جاتا ہے ۔ ایک کامیاب اور ماہر مدرس جس طرح انگریزی پڑھائے گا جغرافیہ میں اس کا اسلوب بالکل بدلا ہو گا ۔ حساب میں کچھ اور ہو گا، تاریخ میں کچھ اور ہو گا ۔ اس کا مطلب یہ ہوا، کہ ہر نصاب اور ہر درس کے ساتھ طریق تدریس حسب حال تبدیلی قبول کرتا جائے گا ۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہر درس ایک خاص طریق تدریس کا طالب ہوتا ہے

معلم کو دو چیزیں خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہئیں۔
(۱) تربیت کے اصول، نظریات اور قواعد پر اس کی اچھی نظر ہو۔
(۲) یہ کہ ہر نصاب اور درس کا طریقہ درس وہ پہلے سے سوچ بچار کے بعد معین کرے۔

ماہر مدرس وہی ہے، جو طفل کی حیثیت اور اہلیت سے قرار واقعی واقف ہو اور صحیح راستہ کی طرف لے جا سکے۔ مدرس کو چاہئے کہ وہ خود اپنے تئیں بچہ سمجھ لے، اور اس کے ساتھ قدم بہ قدم پاؤں پاؤں چلے۔ یہاں تک کہ اسے مردِ کامل بناوے، اور اس مقصد تک پہنچ جائے، جو منتہائے نظر ہے۔

(۴۳)

تربیت جدید کے بنیادی مسائل

جدید فن تربیت کے اہم مبادیات

اب ہم جدید فن تربیت کے اہم اور بنیادی مسائل کا نمبروار تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) تلامیذ کے میلان کی رعایت، تاکہ وہ درس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

(۲) تلامیذ کے نشاطِ ذاتی میں اشتراکیت، تاکہ وہ اُستاد کے ساتھ گھل مل سکیں، اور اپنے اعمال و افکار میں اسکی مدد بطور خود حاصل کر سکیں۔

(۳) کھیل کا وسیلۂ تربیت بنانا۔ کہ کھیل کھیل میں بھی طلبہ کو بہت کچھ سکھایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر مرحلہ طفولیت میں تو یہ طریقہ بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔

(۴) تہدید یا ریپٹ، ڈانٹ ڈپٹ کے بجائے، تلامذہ کو سمجھا

بجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنا۔

(۵) طلبہ میں درس اور عمل کی رغبت پیدا کرنے کی سعی کرنا، تاکہ وہ جو کچھ کریں، اور جو کچھ پڑھیں اس میں جبر کو دخل نہ ہو۔ بلکہ شوق اور رغبت کی کارفرمائی ہو۔

(۶) بچہ کے بچپن کی پوری پوری رعایت ملحوظ خاطر رکھنا اور اسے تمام باتوں اور کاموں پر مقدم رکھنا، اور اس طرح اسے آنیوالی زندگی کے لئے تیار کرنا۔ تاکہ تعلیم نظری اور عملی میں تطابق اور ہم آہنگی پیدا ہو۔ اور بچہ بھاگے نہیں بلکہ از خود آئے۔

(۷) تعاون اور اشتراک کی اسپرٹ پیدا کرنا۔ ایسی روح کو تلمیذ مدرس سے معلم تلمیذ سے، باپ استاد سے، گھر مدرسہ سے متعلم کے نہوض اور ارتقاء کیلئے، سچائی کے ساتھ، ایک دوسرے کی مدد کریں۔ ایک دوسرے سے اشتراک عمل اور تعاون کریں۔

(۸) تلامیذ میں اعتماد نفس کی روح پیدا کرنا۔ تاکہ وہ دوسرے کے بجائے خود اپنے اوپر، اپنی ذہانت اور عقل پر بھروسہ کرنے کے عادی بنیں۔ اپنے اعمال اور بحث میں ان کی نظر کسی دوسرے پر نہ پڑے بلکہ خود ہی اپنی ذات کا سہارا لیں۔ مدرس سے صرف اس وقت مدد لیں جب بے بس ہو جائیں۔ ورنہ اپنے شعور سے کام لیں۔

(۹) حواس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا۔ حواس کی پوری پوری تربیت کرنا۔ کہ حواس کی تربیت درحقیقت عقل کی تربیت ہے۔

(۴۴)

نئے تدریسی تجربے

قدیم اندازِ تدریس سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر نے کچھ نئے تدریسی تجربے بھی کئے ہیں۔ جو بر سرِ کار ہیں۔ آنیوالے صفحات میں ان تجربوں کو ہم نام بہ نام ذرا بسط و تفصیل کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

(۴۵)

طریقہ استنباط

یا

(۱) طریقہ استقرائیہ

طریقہ استقرائیہ یا استنباطیہ کا مقصود یہ ہے کہ معلم حقائق تک پہنچے۔ احکامِ عامہ کو سمجھے اور اس کام میں طریق بحث و استقراط استنباط نظر انداز نہ ہونے پائے۔ اس طریقہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ پہلے جزئیات سے کلیات اور قاعدۂ عامہ تک پہنچتے ہیں۔ مثلاً ایک مسئلہ ہے معلم تختہ سیہ پر اس کی متعدد مثالیں لکھتا ہے، یہاں تک کہ ایک قاعدہ بھی مرتب کر سکتا ہے اور مثالیں بھی پیش کر سکتا ہے اس طرح تلامیذ کی قوت فکر ترقی کرتی ہے اور غبی سے غبی طالب علم کی فکر بھی روشن ہو جاتی ہے۔

یوحنا فریڈرک ہربرٹ کے بنائے ہوئے اصولوں پر یہ طریقہ وضع کیا گیا ہے۔ اس کے بتائے ہوئے طریقہ کا ایک پورا سلسلہ ہے، جو "سلسلہ ہربرٹ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس سلسلہ کی ہر کڑی عمل اور تحقیق

پر مبنی ہے۔ تاکہ درس کا صحیح مقصود حاصل ہو سکے اور یہ مقصود ایک مرتب اور منظم اصول کو سامنے رکھ کر حاصل ہو۔

ہربرٹ نے جو اصول وضع کئے ہیں۔ ان میں چار اصول خاص طور پر بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

(۱) وضاحت (۲) لفظ اور معنی کے درمیان ربط

(۳) نظام (۴) طریق و اسلوب

وضاحت اس کا مقصد ہوتا ہے۔ متعلمین کو نئے سبق کو تیار کرنا اور ان میں تشویش پیدا کرنا، طلبہ کے قدیم اور جدید معلومات میں ربط پیدا کرنا، اور انہیں تطبیق دینا۔ طلبہ کے اذہان کو نئے سبق کے لئے آمادہ کرنا۔

معنی اور ربط یعنی درس میں مرتب طور پر حقائق پیش کرنا، پھر طلبہ کو باہمی جدل و بحث کا موقع دینا کہ وہ کنہ تک پہنچیں اور صحیح نتیجہ اخذ کرلیں، جدید و قدیم معلومات میں ربط پیدا کریں۔ متشابہ اور متضاد اشیاء میں موازنہ کرکے صحیح رائے قائم کرسکیں۔

نظام عناصر کی ایسی منظم ترتیب کہ صحیح حکم لگانے میں کوئی دشواری نہ ہو بلکہ آسانی کے ساتھ صحیح حکم لگایا جاسکے، یا بغیر کسی زحمت کے قاعدہ مستنبط کیا جاسکے۔ یعنی عقل محسوس سے معنی کی طرف منتقل ہو سکے۔

طریق و اسلوب یہ مرحلہ ہے تطبیق اور مراجعت کا۔ قاعدہ کی معرفت کے بعد اس کی تثبیت مشغول اور

سوالوں کے ذریعہ بہت آسان ہو جاتی ہے۔ اس طریقہ پر عمل کرنا۔

ہربرٹ کے بعض متبعین مثلاً" رنیلر (۱۸۱۷ء تا ۱۸۷۲ء) اور رین (ولادت ۱۸۴۷ء) وغیرہ نے کچھ اور تنقیحات وضع کی ہیں جو پانچ ہیں۔

(۱) مقدمہ (۲) غرض (۳) ربط

(۴) استنباط (۵) تطبیق ومراجعت

ہربرٹ کے طریقہ پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عقل کیلئے تکوین حکم آسان ہو جاتی ہے۔ یہ طریقہ رعقلی اصول تحلیل شئے پر مبنی ہوتا ہے، پھر اس چیز اور دوسری چیز کے مابین موازنہ میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔ متشابہ اور متضاد اشیاء میں تمیز کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے اور اس بحث کے بعد حکم لگانے میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی اور پھر عام حکم ذہن ودماغ پر اچھی طرح نقش ہو جاتا ہے اگر تمرینات (مشق) تطبیقات، اعادہ اور مراجعت سے کام بن جائے تو زیر بحث قاعدہ تلمیذ کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔

ہربرٹ کے اصول نے ۱۹ ویں صدی کے نصف آخر میں فن تدریس وتعلیم پر بہت اثر کیا۔ ۱۸۹۵ء میں اپنی مقبولیت کے باعث یہ طریقہ یہ طریقہ جرمنی سے چل کر انگلستان میں بھی رائج ہو گیا، اور ہربرٹ اور اس کے جانشینوں کے بنائے ہوئے اصول اربعہ یا خمسہ، بہت سے

اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہو گئے ۔

نقد و تبصرہ موجودہ وقت میں اصول استقرائی، تقریباً غیر طبعی سا ہو گیا ہے اور اس کی افادیت پہلے سے کم ہو گئی ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ہربرٹ کی اس عظیم و جلیل خدمت سے انکار کر رہے ہیں۔ جو اس نے تعلیم و تدریس کی انجام دی وہ پہلا شخص ہے جس نے حجرۂ درس میں علمی طریقہ کو رواج دیا۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ایک چیز ہر زمانہ میں یکساں مفید نہیں رہتی ۔

اس طریقہ میں ایک اور نقص بھی ہے ۔ یہ مدرس کے لئے بہت زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے ۔ اس میں تلمیذ کو فکر و غور کی زیادہ فرصت بھی نہیں ملتی۔ وہ اپنے اوپر پورے طور پر اعتماد بھی نہیں کر پاتا۔ محتاج امداد رہتا ہے ۔ اس طریقہ سے جو فائدہ ہے وہ یہ ہے کہ افکار مرتب ہو جاتے ہیں ۔ مدرس طلبہ کے قویٰ کے مطابق ان کے ساتھ قدم بہ قدم چل سکتا ہے طلبہ میں موازنہ ملاحظہ اور حکم لگانے کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مدرس طلبہ کو علم کا شائق بنا دیتا ہے اور آسانی کے ساتھ تعبیر افکار کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے طلبہ کے ذہن میں مواد تعلیم کو راسخ کر دیتا ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ اس طریقے کو برتنے میں مدرس کو کافی زحمت اٹھانی پڑتی ہے ۔

(۴۶)

(۲) طریقۂ قیاسیہ

طریقۂ قیاسیہ، طریقہ استقرائیہ کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں سب سے پہلے قواعد اور تعریف کو یاد کرنا پڑتا ہے۔ پھر مثالوں سے اس کی تشریح کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ چھوٹے بچوں کے لئے بالکل موزوں نہیں ہے۔ لیکن بڑے طلبہ کے لئے بہت موزوں ہے یہ طریقہ طالب علم کو کام کم کرنا پڑتا ہے۔ مدرس کو زیادہ۔ یہ فن تاریخ، لغت اور علوم ریاضیہ میں بہت بکار آمد ہے۔

معلم کے لئے بہتر اور مناسب طریقہ یہ ہے کہ وہ طریقۂ استقرائیہ اور طریقۂ قیاسیہ کو مجتمع کرکے کام چلائے۔ ان دونوں طریقوں کو اگر ساتھ ساتھ برتا جائے تو بہت اچھا ہے۔ یہ دونوں طریقے ایک ہی درس میں بروئے کار لائے جا سکتے ہیں مثلاً اس طرح کہ مدرس پہلے

مثالیں پیش کرے، پھر طلبہ کو بحث وجدل کا موقع دے، یہاں تک
کہ وہ اصول اور قواعد مستنبط کر سکیں۔ پھر اس کا اعادہ کرائے، اور
اُس قیاس کو بنیاد قرار دے کر تطبیق دے جو قاعدہ حاصل ہوا ہے
یہاں تک کہ بات ذہن میں راسخ ہو جائے۔

دونوں اصولوں میں موازنہ

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں طریقۂ استقرائیہ میں مدرس تلامیذ
کے ذہن کو خاص سے عام کی طرف منتقل کرتا ہے۔ مثالیں پیش کر
کے قواعد کی تشکیل کرتا ہے۔ جزئیات سے کلیات تک پہنچتا ہے
طریقۂ قیاسیہ اس کے بالکل برعکس ہے اس میں یہ ہوتا ہے کہ
مدرس طلبہ کے ذہن کو عام سے خاص کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اس
میں قاعدہ سے مثالیں بنائی جاتی ہیں۔ اور کلیات سے جزئیات
تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس اصول میں مدرس طلبہ پر اعتماد نہیں کرتا
بلکہ وہ قاعدہ اور اصول پیش کرتا ہے اور طلبہ اسے سنتے اور یاد
کرتے ہیں۔ اس میں طلبہ اپنے بجائے مدرس پر تکیہ کرتے ہیں۔ یوں
سمجھنا چاہئے، طریقہ استقرائی، طریقہ ایجابی ہے اور طریقہ قیاسی
طریقہ سلبی۔ یہ غلطی ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک پر اکتفا کر لیا جائے
مناسب اور بہتر یہ ہو کہ دونوں سے فائدہ اٹھایا جائے اور دونوں کو برتا جائے کیونکہ
طلبا بحث و درس میں طریق استقرائی کی محتاج ہوتی ہیں اور مرحلہ تطبیق میں انہیں طریقہ
قیاسیہ سے فائدہ پہنچتا ہی یہاں تک کہ قاعدہ ذہن میں پوری طور سے راسخ ہو جاتا ہے
استقرا سے ہم قاعدے تک پہنچتے ہیں، قیاس سے مشق کرتے ہیں

(۴۷)

طریقۂ اخباریہ

یا

(۳) طریقۂ محاضرات

اقتصادی نقطۂ نظر سے یہ طریقہ بہت مفید و مستحسن ہے۔ اس طریقہ کی رو سے لیکچروں یا کتابوں کے ذریعہ تعلیم دیجاتی ہے اور انسان ایک ہی حالت میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو زیورِ تعلیم سے بہرہ ور کر سکتا ہے یہ طریقہ نیا نہیں ہے، عہد قدیم سے رائج ہے۔ پہلے زمانہ کے کالجوں میں اور جامعات میں عرصۂ دراز سے یہ طریقہ چلا آ رہا ہے جس زمانہ میں کتابوں کی طبع و اشاعت کا انتظام نہیں تھا تو قرون وسطیٰ میں جامعات میں، لیکچروں کا اچھا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ان لیکچروں میں ہزارہا طلبہ شرکت کیا کرتے تھے۔ استاد لیکچر دیتا تھا اور طلبا گوش ہوش سے سنتے تھے۔ یہ طریقہ عہد جدید میں بھی یورپ، امریکہ، مصر اور دوسرے ممالک میں رائج ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ طریق محاضرات (لیکچر) سے صرف بڑی عمر اور بڑے درجوں کے طلبہ پورے طور پر مستفید ہوسکتے ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے طلبہ کے لئے یہ طریقہ کچھ زیادہ سودمند نہیں ہے۔ روسو کا خیال ہے کہ چھوٹے لڑکوں کے سامنے تقریروں اور لیکچروں کا سلسلہ زیادہ طویل نہ ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ وہ ان چیزوں کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتے اور بہت کم سمجھتے ہیں، نہ سمجھنے کے برابر۔

طریق محاضرات کے عیوب

طریق محاضرات میں کچھ عیوب بھی ہیں۔ اور اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔

(۱) اس سے طالب علم کا اعتمادِ نفس کم ہوجاتا ہے۔ قوتِ عمل کمزور پڑجاتی ہے وہ بحث و استفسار سے کترانے لگتا ہے۔

(۲) لیکچر دینے والا اپنے لکھے ہوئے لیکچر کو جلدی جلدی پڑھتا ہے اور سننے والے طلبہ جلدی جلدی اس لیکچر سے اپنے نوٹ لیتے ہیں نوٹ لیتے وقت بہت سی چیزیں چھوٹ بھی جاتی ہیں اور بہت سی باتیں ذہن و دماغ پر مرتسم بھی نہیں ہوتیں۔

خلاصہ کلام

یہ کہ طریق محاضرات بہت زیادہ سودمند نہیں ہے اور اگر کسی درجہ میں ہے تو صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ڈگری کیلئے اور ایسے طلبہ کیلئے وقت بچانے کا بہترین ذریعہ ہی نہیں ایک مرتب اور منظم درس مل جاتا ہے اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھالیتے ہیں!!

(۴۸)

(۴) طریقۂ سقراطیہ

یا

طریقۂ حواریہ

یہ طریقہ سقراط کی طرف منسوب ہے۔ سقراط، یونان کا باشندہ تھا۔ اس طریقہ میں، سوال و جواب پر تعلیم کا انحصار ہوتا ہے، یا نقش و رسم سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو معلومات کا خزینہ بنا دیا جائے۔ ان میں حقیقت کی تلاش کا جذبہ پیدا کر دیا جائے۔

اس طریقہ کو جاری کرنے سے سقراط کا اہم ترین مقصد یہ تھا کہ عقل انسانی سے اوہام کا ازالہ ہو جائے اور ان مصیبتوں سے نجات مل جائے جو علم اور تعلیم کے راستے میں حائل تھیں۔ اس طریقہ میں سوالات کے ذریعہ طالب علم کی حس کو ابھارتا ہے تاکہ وہ بحث و تنقیب اور تفکیر و تہذیب کا خوگر بن سکے۔

نقد و تبصرہ

یہ طریقہ اگرچہ فکر عمیق کا موجب ہے اور یہ

بہت بڑا فائدہ ہے لیکن اس میں ایک نقص بھی ہے وہ یہ کہ اس
میں بہت بڑی مدت حقیقت کی تلاش وجستجو اور اس تک پہنچنے
میں صرف ہوتی ہے۔ کمزور قسم کے مدرسین تو اس سے بالکل فائدہ
نہیں پہنچا سکتے۔ نہ خود مستفید ہو سکتے ہیں اس طریقہ کو بروئے کار لانے
کے لئے بہت زیادہ قابلیت اور مہارت کی ضرورت ہے اس میں
تلمیذ اور مدرس دونوں کو بہت زیادہ چوکس رہنا چاہئے یہ طریقہ، طریقہ
ارشادیہ اور طریقہ تنقیدیہ کا جامع ہے۔ اس لئے کہ یہ بحث ارشاد
اور فکر کا ہمیشہ جویا رہتا ہے۔

بعض لوگ اسے سب سے بہتر طریقہ تعلیم سمجھتے ہیں لیکن وہ
اسے فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ کثیر وقت میں بہت قلیل فائدہ پہنچاتا
ہے معلم اگر اس طریقہ میں کامیاب ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ
وہ درس کی پوری تیاری کرے سوالات پورے وقت سے
مرتب کرے۔ تاکہ آسانی کے ساتھ وہ طلبہ کے اذہان تک رسائی
حاصل کر سکے۔ سقراط صرف سوالات کے ذریعہ اپنا مفہوم واضح کرتا تھا
اور دوسرے کا مفہوم اگلتا تھا۔ اسی طرح وہ تلمیذ میں بحث واستفہام
کا مادہ پیدا کرتا تھا۔ تاکہ وہ حقیقت تک پہنچ سکے۔

(۴۹)

(۶) طریقہ تنقیبیہ

یہ طریقہ بحث و تنقیب پر مشتمل پر ہے جس میں کتب معینہ سے خاص موضوعات تک رسائی ہوتی ہے اور مدرس تلامیذ کے سامنے درس کتابی دیتا ہے تاکہ طلبہ ان کتابوں سے فائدہ اٹھائیں اور ایک محدود مدت میں نفع اندوز ہو لیں۔

عہد حاضر میں، یہ طریقہ سب سے زیادہ مفید اور کارگر ہے اس سے تلمیذ کے اندر اعتماد نفس کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور بچپن ہی سے وہ کثرت اطلاع اور کثرت مطالعہ کا عادی ہو جاتا ہے مدارس ابتدائیہ میں اسے تیسرے یا چوتھے سال سے باآسانی شروع کیا جا سکتا ہے، مدارس ثانویہ اور متوسطہ میں تو اس سے بہت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے

اب ہم اس طریقہ کے چند خاص اور متداول طریقوں کا ذکر ذرا تفصیل و وضاحت سے کرتے ہیں۔ تاکہ جدید زمانہ کا یہ اسلوب بھی متعلم اور معلم کے پیش نظر رہے اور اس وقت اور موقع کی مناسبت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔

ان طریقوں کو ہم الگ الگ اور نام بہ نام ذکر کریں گے۔

(۵۰)

(۱) طریقہ ڈلٹن

یہ طریقہ امریکہ کی مشہور ماہر تعلیم خاتون ہیلین پارکھرسٹ کی طرف منسوب ہے سنہ ۱۹۱۹ء میں یہ طریقہ رائج ہوا۔ بعض لوگ قلت معلومات کے سبب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ طریقہ مسٹر ڈالٹن کی ایجاد ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے د صوبۂ مساشٹ میں واقع ہے۔ اس طریقہ کو یہیں آزمایا گیا، اور بر سر کار لایا گیا۔ شاید اسی لئے اس شہر سے یہ منسوب ہو گیا۔

طریقہ ڈلٹن کا مقصد

اس طریقہ کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کے مابین کوئی امتیاز نہیں روا رکھا جاتا۔ نہ درجہ بندی کو کوئی خاص اہمیت دیجاتی ہے۔ اس میں ذہین و غبی تیز اور سست، قوی اور ضعیف طالب علم کے درمیان بھی کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اس میں طلبہ کو پوری آزادی دیجاتی ہے کہ وہ خوب جی

کھول کر بحث کریں، مطالعہ کریں۔ ضرورت محسوس کریں، تو اُستاد کی مدد حاصل کرلیں۔ اس میں بہت زیادہ زور جس چیز پر دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ طلبہ اپنے اوپر اعتماد کرنے کے عادی بنیں۔ یہاں تک کہ بڑے ہو کر عملی آدمی بن سکیں۔ ان میں تعاون اور امداد باہمی کی روح پیدا ہو جائے اس میں ضعیف پیچھے نہیں رہنے پاتا اور ذکی کا، غبی کے انتظار میں وقت نہیں ضائع ہوتا۔

مبادیات

اس سسٹم کے مبادی حسب ذیل ہیں۔

(۱) تلامیذ اُستاد کے ساتھ شریک عمل ہو گے۔

(۲) اس سسٹم میں طریقہ تلقینیہ یا اخباریہ (لیکچرز) جو قرون وسطیٰ میں رائج تھا کم برتا جاتا تھا۔

(۳) حجرہ درس، لیبوریٹری اور تجربہ گاہ میں تبدیل ہوتا جاتا ہے تاکہ طلبہ بطور خود تجارت حاصل کریں اور مشق کریں۔

(۴) اس سسٹم میں مظاہر سے زیادہ حقائق پر غور کیا جاتا ہے۔

(۵) افکار اور تجارت میں ربط پیدا کیا جاتا ہے تاکہ مسئلہ بالکل واضح اور ازبر ہو جائے۔

(۶) طلبہ کو اس سسٹم میں پوری آزادی دیجاتی ہے کہ وہ نتیجہ تک پہنچنے کیلئے جو وسیلہ اور ذریعہ اختیار کریں۔ استاد صرف حسب ضرورت امداد و اعانت یا مداخلت کرتا ہے۔

(۷) سبق بار بار دہرایا جاتا ہے اور کافی وقت حصول نتائج کیلئے دیا

جاتا ہے تاکہ طلبہ خود اپنے اعمال و افکار مرتب کر سکیں۔

(۸) ہر مدرس ایک مخصوص نصاب کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور ایک ہی کلاس لیتا ہے۔

(۹) طلبا میں سے ہر ایک کی استعداد و پیش نظر رکھی جاتی ہیں۔ تاکہ ہر فرد اپنے عقلی اور علمی درک کا صحیح استعمال کر سکے۔ اور اپنی مناسبت کے لحاظ سے جماعت سے اشتراک کر سکے۔

تعینات کی مثالیں

اب ہم اس سلسلہ میں چند خاص تعینات کا ذکر کرتے ہیں جو ڈلٹن سسٹم میں بھی برتے جاتے ہیں۔

۱۔ کتاب کی طرف مراجعت

۲۔ جواب دینے سے پہلے کتاب سے امداد۔

۳۔ اگر بعض مسائل میں دشواری پیش آئے، تو پہلے اپنے سے بڑے طلبہ سے دریافت کیا جائے۔ پھر بھی مشکل حل نہ ہو تو لغت سے رجوع کیا جائے

۴۔ کتاب کی قرات سے فراغت کے بعد اور اس کے مطالب سمجھنے کے بعد حسب ذیل سوالات کا جواب دو۔

(أ) اس کتاب کی کون سی حکایت پسند آئی؟ وہ حکایت بیان کرو۔

(ب) کتاب کے کیریکٹروں میں سے کون سا آدمی پسند آیا؟ اور کیوں پسند آیا؟ اس کے بعض کارناموں کا ذکر کرو۔

(د) دو فصلوں والی کوئی حکایت مختصر طور پر تحریر کرو۔ ہر فصل کتاب ہی سے

ماخوذ ہو۔ یا کسی ایسے موضوع پر لکھو جو تمہیں پسند ہو۔ یا کسی ایسے آدمی پر جس کی جانب تم مائل ہو۔ لیکن تین سطروں سے زیادہ نہیں۔

اس سسٹم کے فائدے

اس سسٹم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طالب علم کے اندر اعتماد النفس پیدا ہو جاتا ہے وہ اپنے قوائے عقلی کا استعمال کرنے لگتا ہے۔ حکم لگانے کی اس میں استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنی بات اور اپنے کام پر بھروسہ کرنے لگتا ہے اثنائے عملی میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اُن پر غالب آنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ درس کے سلسلے میں ایک خاص نظام اور ایک خاص ترتیب کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے اور ٹھیک سے جواب دینے لگتا ہے۔ اطلاع دہی اور قراۃ (مطالعہ) سے اسے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

جب ہم تلمیذ میں علم کا شوق پیدا کر لیں تو اسے کامیاب بنانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی وہ نہ صرف امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی کامیاب رہتا ہے۔ اس طرح اس کے سامنے نئی نئی راہیں کھل جاتی ہیں اور ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسے اتنی فرصت ملتی ہے کہ وہ اپنی عقل، فکر اور ذکا سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے، اور اپنے امیال و عواطف اور اپنی صلاحیتوں کو نمو بخش سکے۔ یہاں تک کہ وہ اس قابل ہو جائے کہ مستقبل میں عمل جلیل کا ہیرو بن سکے۔ یا کوئی بہترین ایجاد کر کے نام پیدا کر سکے۔ یا کوئی ایسی کتاب لکھ کر شہرت حاصل کرے جو سب کیلئے نافع اور مفید ہو!

(۵۱)

(۲) مانٹسوری سسٹم

ماریا مانٹسوری، اٹلی کی مشہور اور یکتا طبیبہ تھی۔ اس کی طرف یہ سسٹم منسوب ہے۔ اس کے اس سسٹم نے اتنا قبول عام حاصل کیا کہ نہ صرف اٹلی میں، بلکہ انگلستان اور امریکہ کے بہت سے مدارس میں مقبول اور رائج ہوا۔

اس سسٹم کا مقصد

مانٹسوری نے یہ محسوس کیا کہ تربیت کا مقصد، تربیت شخصی ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے تعلیمی سسٹم میں سب سے زیادہ زور اسی پر دیا کہ بچہ خود کفیل ہو۔ خود سمجھے، خود کرے، دوسرے کے بجائے خود اپنے اوپر بھروسہ کرے۔ اس سسٹم کے ماتحت طلبہ کو بتایا جاتا ہے کہ انہیں دوسروں کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ کھیل اور کام

میں کس طرح تعاون اور اشتراک کرنی چاہیئے۔ اپنے کاموں میں کس طرح خود اپنے اوپر بھروسہ کرنا چاہیئے؟ نیز یہ کہ تعلیمی کھیلوں سے کس طرح کسب و علم و معلومات کرنا چاہیئے؟

اس سسٹم کے ماتحت بچے استاد کی نگرانی میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ اپنی رغبت اور پسند کے مطابق وہ کام کریں، اور چلیں پھریں۔ انہیں اپنے کام کے سلسلہ میں پوری آزادی دے دی جاتی ہے۔ وہ خود اپنے نکتہ چین اور نگراں بنا دیئے جاتے ہیں۔

مبادیات مانٹسوری سسٹم میں، تعلیم کے اندر فرد کو ایک وحدت تسلیم کیا جاتا ہے حالانکہ قدیم طریقۂ تعلیم میں نظام تعلیم اجتماعی بنیادوں پر قائم تھا۔ اس سسٹم کے مبادیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) عمل میں طلبہ کو پوری پوری آزادی اعتماد نفس کی تشکیل صرف بوقت ضرورت معلم کی مداخلت، ورنہ کامل عدم مداخلت، مطالعہ کیلئے کافی وقت اور فرصت کی بہم رسانی۔

(۲) اس سسٹم میں اسباق کا قاعدہ سلسلہ نہیں ہوتا اور نہ درس کے اوقات معین ہوتے ہیں۔ ہر بچہ اپنی نوعیت کے مطابق پڑھتا ہے۔ جب کھیلنے پر مائل ہوتا ہے، کھیلنے لگتا ہے تربیت علمی و عملی کے سلسلہ میں اسے ہر قسم کے بہتر سے بہتر وسائل

ہوتے ہیں۔

(۳) اس سسٹم میں باقاعدہ کلاس سسٹم (درجہ بندی) نہیں ہوتا جیسا عام طور پر مدارس میں ہوتا ہے۔

(۴) اس سسٹم کے ماتحت مدرسوں میں ثواب و عقاب کا اصول جاری نہیں ہوتا۔ بچہ کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا جاتا کہ وہ جیل خانہ میں ہے، بلکہ اس کے حواس، وجدان، عقل، جسم خلق، شخصیت تمام چیزوں کی تربیت بات ہی بات، اور کھیل ہی کھیل میں کر دیجاتی ہے۔

(۵) ہر لڑکا وہی کام کرتا ہے، جو وہ چاہے، جب وہ مدرسہ پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے، بہت سے بچے مختلف کھیلوں میں مصروف ہیں۔ وہ بھی اس گروہ کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔ جو اس کی طبیعت اور مذاق کے مطابق ہو۔ اگر وہ ایک کھیل سے تھک جاتا ہے تو دوسرا شروع کر دیتا ہے۔

(۶) مانٹسوری کے تعلیمی کھیل خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے تربیت حواس و عقل میں بڑی مدد ملتی ہے۔ بلکہ ان ہی کھیلوں پر تعلیم و تعلم کا زیادہ تر مدار ہوتا ہے۔

فوائد اس سسٹم کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ طلبا کو پوری آزادی عمل حاصل ہوتی ہے۔ ان میں اعتمادِ نفس کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ ان میں عمل کا شوق اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ انہیں یہ علم

ہوجاتا ہے کہ وہ خود اپنا احترام کیوں کر کریں؟ دوسرے کے بارے میں کیوں کر سوچیں؟ سعی و اجتہاد کے خصائص اپنے اندر کس طرح پیدا کریں؟

دوسرا فائدہ اس سسٹم کا یہ ہے کہ مدرس کو اپنے اسباق کی تیاری کا کافی موقع ملتا ہے۔ اسے طلبہ کی ذہنیت اور جبلت کے پہچاننے میں بھی کافی سہولت ہوتی ہے۔ وہ طلبہ کی روح میں گھس جاتا ہے۔ ان کے خلقی اور اجتماعی عیوب کی اصلاح پر قادر ہوجاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدرّس طلبہ کی ماہیت اور حقیقت طبیعت اور فطرت سے اس وقت تک واقف ہی نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنا کافی وقت ان کے ساتھ نہ صرف کرے اور ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ صرف اسی طرح وہ ان میں عادات حسنہ پیدا کرسکتا ہے اور ان کے اخلاق و عادات کی نشو و نما کرسکتا ہے۔

مدرس کے فرائض

مانٹسوری کا قول ہے:۔
"ہم معلمین بیج لیتے ہیں اور فصل کاٹتے ہیں ضروری ہے کہ ہم اپنے کام میں اخلاص اور دیانت داری کو ملحوظ خاطر رکھیں۔"

مانٹسوری کا یہ قول بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ قوم کا مستقبل مدرّس کے ہاتھوں میں ہے۔ آنے والی نسلوں کی بہتری اور

بدتری مدرّس ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ضروری ہے کہ مدرّس اپنے کام میں مخلص اور دیانت دار ہو۔

یہ مدرّس ہی کا کام ہے کہ وہ اپنے طلبہ کے قلوب میں اچھی عادتیں راسخ کردے۔ اور اپنے کام کے صلہ اور داد کی پروا نہ کرے ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ اپنے بچوں کی تحسین و تکمیل کے لئے کرتے ہیں۔ بغیر صلہ اور ستائش کی تمنّا کے۔ ہماری فرصت کا ہر لمحہ اسی کام میں صرف ہونا چاہئے۔ ہمارے کام کو مخلصانہ ہونا چاہئے۔ تاکہ ہم صحیح طور پر اپنا مقصد حاصل کرسکیں، تاکہ ہم وہ نمونہ بن سکیں، جس کی تقلید کی جائے، ہم زندگی کو اس کی ماہیت کو سمجھ بھی سکیں۔ اور سمجھا بھی سکیں۔ ہم جب مرض کے آثار دیکھیں تو فوراً اس کا علاج کرسکیں، ہم اچھی طرح اور صحیح قیادت کرسکیں۔ ہم ٹھیک اور مناسب رہنمائی کرسکیں۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ آپ نے اپنی سب سے قیمتی اور گرانمایہ پونجی ہمارے حوالہ کی ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پونجی کی حفاظت کریں، اور اسے ضائع نہ ہونے دیں۔ اس کی صحیح نشو و نما کریں۔ یہاں تک کہ خدا اور ہمارا ضمیر ہم سے راضی ہو جائے۔ اور ہم علم و تعلیم کی صحیح خدمت انجام دے سکیں۔

؛
٭

(۵۲)

(۳) طریقہ تمثیلیہ

یہ سسٹم ـــــ حرکت، عمل، نشاط اور کھلی ہوا پر مشتمل ہے۔ تاکہ تلامیذ اور مدرسین کی صحت درست رہے۔ اس سسٹم کی رو سے نہ درجہ بندی ضروری ہے نہ اسباق کیلئے کلاس کی ضرورت ہے۔ اس میں اسباق باغیچہ کے صحن میں بھی دیئے جا سکتے ہیں۔ کھیل کے میدان میں بھی اور کتب خانے میں بھی۔

یہ سسٹم تعلیم کا ایک خاص ذوق پیدا کر دیتا ہے۔ اطفال کو اسباق کی فہم میں آسانی اور سہولت ہوتی ہے طلبہ عمل پر زیادہ زور دینے لگتے ہیں۔ اس سسٹم کی تعلیم سراسر علمی ہوتی ہے۔ اور تلامیذ سرتاپا عمل بن جاتے ہیں۔ اس وقت بہت ہشاش بشاش ہوتے ہیں۔ جب کسی سبق کو تمثیل (PLAY) کے ذریعہ

عمل میں لاتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے وہ اپنے تمام کام بڑی رغبت اور شوق سے انجام دیتے ہیں اور جو کچھ امکان میں ہوتا ہے کر گزرتے ہیں۔ تاکہ ان کا کھیل (PLAY) زیادہ سے زیادہ کامیاب ہو۔ اگر انہیں اپنے ساتھیوں اور استادوں کا تعاون حاصل ہو، پھر تو ان کے جوش عمل کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اس سسٹم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر مدرسہ میں پڑھے ہوئے تاریخی اسباق آپ کو یاد نہیں رہتے تو طریقہ تمثیل (PLAY) سے فائدہ اٹھانے کے بعد وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں گے۔

رابرٹ لوئس اسٹیونسن کا قول ہے۔

"ہم بڑے لوگ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے سامنے ایک قصہ بیان کرتے ہیں اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن ایک بچہ جب ایسے موقع پر چپ چاپ نہیں بیٹھ سکتا، وہ اسے کسی طرح بھی بروئے عمل لانا چاہتا ہے۔

طریقہ تمثیلیہ کے فوائد طریقہ تمثیلیہ سے روایت کی صحیح حقیقت اور ماہیت طالب علم پر منکشف ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ مدرس کی پوری رہنمائی اسے حاصل ہو۔ پھر اس کی تالیف اور کتابت بھی اس کے لئے آسان ہو جاتی ہے وہ اس زمانہ کے لباس، عادت، افکار وغیرہ پر حاوی

ہو جاتا ہے ۔ اس میں نقد کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس سسٹم کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بھولی بسری باتیں یاد ہو جاتی ہیں ۔ اقدام اور خطابت کے لئے کافی وقت مل جاتا ہے ۔ بحث و کتابت اور سوال و جواب کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے ۔

تاریخ کی تدریس

تاریخ کا درس اگر تمثیلی طریقہ سے دیا جائے تو بہت سود مند اور کارگر ہوتا ہے طلبہ ، بادشاہوں ، لیڈروں ، بڑے بڑے لوگوں اور تاریخی شخصیتوں کی تمثیل سے بہت سے فائدے اٹھاتے ہیں ، اور تاریخی روایات کو زیر تمثیل لانے کے بعد ان کی بہت سی دبی ہوئی صلاحیتیں اُبھر آتی ہیں ۔

تربیت دہندہ کو جاننا چاہئے کہ تمثیل کو کامیاب بنانے کے لئے ادبی اور اجتماعی کتابوں کے مطالعہ کی شدید ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ ان میں سے ادبی ، تاریخی ، خلقی ، اجتماعی ، روایات منتخب کر سکیں ۔ جو ان کے اور سوسائٹی و مجتمع کے لئے مفید ہوں ضروری ہے کہ جہاں یہ سسٹم رائج ہو ۔ وہاں لائبریری بہت عمدہ ہو ۔ اور متعلقہ عنوانات پر مستند اور اچھی کتابوں کا معقول ذخیرہ موجود ہو ۔ جو طلبہ کے عقلی اور علمی مادّہ کو شگفتہ کریں ۔ اور ان سے مراجعت کر کے وہ اپنے علم اور معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کر سکیں ۔

مدرس کا فرض ہے کہ وہ طلبہ کی ایسی کتابوں کی طرف رہنمائی

کرے جو موضوع تمثیل کی مناسبت رکھتی ہوں، ایک فائدہ اس طریقہ کا یہ بھی ہے کہ طلبہ کتابوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، وہ مجبور ہیں کہ اپنے موضوع پر ایک نہیں درجنوں کتابوں کا مطالعہ کریں اور اُن سے کام کی باتیں روز کریں، اپنی مشکلیں اُستاد کی مدد سے رفع کریں۔ اور اقدام و عمل کی پیدا کریں، وہ بحث مباحثہ پر بھی مجبور رہوتے ہیں، اور اس سے بھی اُن کے علم اور معلومات میں خاص اضافہ ہوتا ہے۔ ان میں ایک خاص توازن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کام کی بات لینے، اور غیر ضروری بات چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک لڑکا تمثیل کا ایک پارٹ کرنا چاہتا ہے لیکن ساتھیوں کی اکثریت اسے اس کام کے لئے موزوں نہیں سمجھتی، وہ اکثریت کے آگے سر جھکاتے، اور اپنا ارادہ ترک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور اپنی جگہ اپنے دوسرے ساتھی کے لئے چھوڑ دیتاہے اس طرح صلاحیت اور استعداد کا بھی امتحان ہوتا رہتا ہے اور اس کا غلط استعمال ہونے نہیں پاتا۔ مدرّس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے طلبہ کے لئے دوست، اور بھائی اور ساتھی ثابت ہو حاکم مستبد نہیں، وہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم نہ دے، بلکہ اس طرح سمجھائے کہ بات تمام طلبہ کے دل میں اُتر جائے اور گھر کرے۔

ژ

(۵۳)

(۴) طریقہ مشروع

یہ سسٹم، امریکی ماہر تربیت و فلسفی جان ڈیون کے نظریہ پر مبنی ہے اس سسٹم کے پانچ مراحل ہیں، اور وہ یہ ہیں۔

(۱) صعوبت اور مشکل کا شعور

(۲) صعوبت اور مشکل کی شناخت اور اس کی حدبندی۔

(۳) اس کے حل پر غور اس کے طریقے اور اس کی صحت پر استدلال

(۴) ممکن حل کی طرف اشارہ۔

اس نظریہ کے ماتحت ضروری ہے کہ تلمیذ خود صعوبت اور مشکل کا شعور کرے، اسے حل کرنے کی تدبیر سوچے، اس کی اصل و حقیقت کو سمجھے، اس پر غالب آنے اور اُسے حل کرنے کی کوشش کرے۔

اس سسٹم میں طالب علم خود اپنی فکر پر بھروسہ کرتا ہے، خود ہی بحث کرتا ہے، خود ہی جواب دیتا ہے۔ اپنے گذشتہ تجارب کا بھی سہارا بھی لیتا ہے۔ کسی دوسرے سے ہرگز مدد نہیں لیتا، سوائے اس صورت کے بالکل مجبور ہو جائے۔

تفکر، مستقل تربیت استقلالیہ وعقلیہ کے طریقے مشروع سے بڑھ کر کوئی اور طریقہ نہیں۔ اس سسٹم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ طلبہ کے افعال، اُن مشروعات کے گرد گھومتے رہتے ہیں، جنھیں بروئے کار لاتے کا انھوں نے پروگرام بنایا ہے۔

امریکہ میں طلبہ کے لیے جو مشروعی (یا تشریحی) پروگرام بنایا جاتا ہے وہ زیادہ ترحسب ذیل چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

(۱) مرغبول کی تربیت (۲) مکاتیب کی تنظیم
(۳) تکوینی اعمال (۴) مدرسہ کے میگزین کی طباعت واشاعت
(۵) جغرافیہ کے کسی موضوع پر کسی کتاب کی تدوین۔

یہ اور اسی طرح کے عنوانات پر طلبہ ابتدا سے لے کر انتہا تک تیاریاں کرتے ہیں، اور اپنے پروگرام کو کامیاب بناتے ہیں۔

اس سسٹم کو بروئے کار لانے میں مدرس کو بہت زیادہ ماہر ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ طلبا کے فردی اعمال تمام تر مدرس کی ہدایت اور رہنمائی سے تربیت پاتے ہیں۔

(۵۴)

طریقہ لعب

یہ سسٹم مشہور انگریز ماہر تربیت کالڈول کوک سے منسوب ہے۔ اس سسٹم سے طلبہ میں عمل اور تنقیب کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے، محاضرات (لیکچرز) اور مناظرات سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ تمثیل روایات، اور کتابت مقالات سے انتفاع کیا جاتا ہے۔ قصائد شعریہ سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا ہے فنون جمیلہ۔ موسیقی، غنا، نقاشی، اور تصویر کشی کو بھی اس سسٹم میں بہت دخل ہے۔

اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں، کہ مدرس اسلاف درس اور مبادی علوم میں کس طرح طلبہ کی رہنمائی کرتا ہے:-

بچہ پر کھیل کا بڑا اثر پڑتا ہے وہ کھیل سے بے اختیار دلچسپی

لیتا ہے، پس اگر بچہ کو کھیل ہی کھیل میں سبق دیا جائے، اور اس کی تربیت کی جائے، وہ راسخ بھی زیادہ ہوتی ہے، اور سودمند بھی بہت ہوتی ہے، یہ سسٹم اگر اصول اور ضابطہ کے ساتھ برتا جائے، تو اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے: مدرس کے احاطے میں، کتابت، قرارت، قواعد، انشا، حساب، جغرافیہ نقاشی، تصویر کشی، عدا وغیرہ کی تعلیم بحسن وخوبی دی جا سکتی ہے۔ مدرس کے لئے بہتر یہ ہے کہ مبادیٔ علوم کی تدریس و تربیت میں طبیعت پر بھروسہ کرے، نقشے، تصویریں، کتابیں، نمونے اصطلاحات علمیہ، یہ چیزیں اچھی طرح نہ بچہ کی سمجھ میں آ سکتی ہیں، نہ ان سے اُسے مستفید کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی تدریس سے بچہ میں لذت اور سرور کا مادہ نہیں پیدا ہوتا۔

مدرس کے واجبات مدرس اگر سسٹم کے ماتحت طلبہ کو تعلیم دے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ:

(۱) طلبہ کو بتائیے کہ یہ دنیا جو انہیں گھیرے ہوئے ہے کیسی ہے؟ اور وہ اسے کس طرح محسوس کرتے ہیں؟

(۲) جو کچھ بچے دیکھیں، مدرس انہیں اکسائے کہ خود اپنا تاثر بیان کریں، اور جو کچھ ان کے دل میں ہے، اس سے اچھی طرح تعبیر کر سکیں۔

(۳) طلبہ کو بحث و جدل کی پوری آزادی دے، ایک دوسرے سے خوب بحث کریں، یہاں تک کہ اپنے خیالات و محسوسات اور جذبات کی تعبیر پر پوری طرح قادر ہو جائیں۔

مدرس کو یہ بھی چاہیئے، کہ اگر وہ اپنے مذاکرہ میں عالم طبعی کی طرف متوجہ دیکھے کہ اسرار حیات پر وہ غور و فکر کرتے ہیں تو انہیں اور زیادہ تجربہ اور تفحص پر اُکسائے۔ یہاں تک کہ اس تجربہ اور تفحص سے اُن میں نشاط کار کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ بحث و اطلاع کی طرف راغب ہوں۔ اور حسب ضرورت استاد سے مدد بھی لیں۔

اگر جوان طلبہ میں تفحص اور اطلاع کا جذبہ پیدا ہو تو اُن کی بھی قرار واقعی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ اُن کی اس بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے یا مدھم کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ اس طرح تحقیق و تفحص، تلاش اور جستجو کی اُمنگ پیدا ہوتی ہے، اور وہ زندگی کے میدان میں بہت کام دیتی ہے۔ مدرس کو کوشش کرنی چاہیئے کہ اس کے طلبہ اُن آلات کی طرح نہ ہوں، جو دوسروں کے ہاتھ کے محتاج ہوتے ہیں۔ نہ اِن حیوانوں کی طرح ہوں، جو سمجھ بوجھ سے محروم ہوتے ہیں، وہ بغیر فکر کے عمل نہ کریں۔ ان کا عمل فکر کا تابع ہونا چاہیئے۔

ؤ

(۵۵)

(۶) ڈکرولی سسٹم

یہ سسٹم، ماہر تربیت وعلم النفس، اوید ڈکرولی کے نام
سے منسوب ہے۔ اس کی اپنی تربیت گاہ بروکسل کے مضافات
میں تھی جس کا نام ڈرمناج تھا۔ ڈرمناج بروکسل کی ایک
سڑک کا نام ہے ۱۹۲۷ء میں ڈکرولی اپنی تربیت گاہ، وہاں
سے منتقل کرکے پایہ تخت کے قریب لے آیا۔

جدید اصول تربیت، جدید علم النفس، اور جدید فن تعلیم کا
یہ سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں تربیت جسمیہ پر بھی، تربیت حواس
کے ساتھ زور دیا جاتا ہے اور تربیت عملیہ بھی نظر انداز نہیں
کی جاتی، اعتماد اس سسٹم کا خاص جوہر ہے۔ اس میں تربیت
کا کوئی گوشہ نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ عقل روح اور اجتماعیت سبکو

پورا پورا حصہ دیا جاتا ہے۔ تلمیذ کو پوری پوری آزادیٔ عمل دی جاتی ہے۔ کھیل کے دوران میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے طلبہ کو حرکت اور عمل کی طرف خاص طور سے راغب کیا جاتا ہے کھلی ہوا میں سبق دیا جاتا ہے، جہاں کلاس کی گھٹن محسوس نہیں ہوتی۔ سبق اتنا ہی اور وہی دیا جاتا ہے جو عقل و ذہن سے مناسبت رکھتا ہو، طبیعت کے مطابق ہو۔ اس سسٹم کے ماتحت مدرسہ، زندگی اور اس کے کوائف سے بالکل متصل رہتا ہے، تلمیذ زندگی کے لئے سیکھتا ہے۔ سبق اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اچھی طرح زندہ رہ سکے، اور زندگی سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے۔ ڈکرولی کی تربیت گاہ میں کلاسوں کی حیثیت کارخانوں اور لیبوریٹریوں کی سی ہے، چھوٹے سے چھوٹے بچوں کی بھی اسی طرح کھلا کھلا کر اور بہلا پھسلا کر تعلیم دی جاتی ہے، مار پیٹ اور سزا و عقوبت کا نام بھی نہیں۔

مبادیات ڈکرولی نے اپنی تربیت گاہ کے جو مبادیات وضع کئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) قوت مشاہدہ! طلبہ مدرسہ میں جو کچھ دیکھتے ہیں، جو کچھ ان کے گرد و پیش ہے، اُسے دیکھنا، سمجھنا، جاننا، حواس کا صحیح استعمال، باغیچہ اور کھیتی کی تنظیم، اکسکرشن۔

(۲) معلومات سے انتفاع! تجربہ اور عمل کے اثنا میں جو معلومات

حاصل ہوں، اُن کی ترتیب وتدوین، اور تنظیم، نقاشی
اور تصاویر کے ذریعہ اُن کی توضیح وتشریح۔

(۳) لغت وتعبیر کی طرف توجہ! ڈکرولی، لغت کو تدریس و
تربیت میں بہت اہمیت دیتا ہے، یہاں تک کہ تلمیذ
تعبیر، مافی النفس پر اچھی طرح قادر ہو جائے۔ وہ اپنے
افکار، اپنی زبان، اپنے قلم، اپنے نقش سے اچھی طرح
ظاہر کر سکے، اسی لئے اس سسٹم میں تلمیذ کو نقاشی، غنا
قرأت، طباعت اور موسیقی میں بھی درک پیدا کرایا جاتا
ہے اور یہ تمام کے تمام وسیلۂ تعبیر ہیں۔

(۴) میلان کی رعایت! عقل کے میلان، اور اس کی سوسائٹی
کی بھی پوری رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

(۵) اعتماد نفس اور تعاون! ڈکرولی سسٹم میں، اعتمادِ نفس
اور تعاون کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ ڈکرولی کی تربیت
گاہ میں طالب علم کو خاص طور پر، اعتماد نفس، اور تعاون
کے جوہر سے آشنا کیا جاتا ہے۔ وہاں تلمیذ کو کافی وقت دیا
جاتا ہے کہ وہ تجربہ کرے، عمل کرے، مطالعہ کرے۔ بحث
ومناظرہ کرے، اور اصل حقیقت تک پہنچے۔

ڈکرولی تربیت گاہ میں تربیت خلقی، تربیت وجدانی
تربیت اجتماعی، تربیت جسمانی، عقلی اور ذہنی کو بھی ہمہ وقت

پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ وہاں کا طالب علم اپنے مدرسہ کے بھائیوں سے محبت کرتا ہے۔ اپنے اساتذہ کی وقعت کرتا ہے سوسائٹی کے ساتھ تعاون کرتا ہے، وہاں کے طلبہ کے اجسام مضبوط ہوتے ہیں، عقل پختہ ہوتی ہے، عواطف شائستہ ہوتے ہیں۔ ذوق سلیم ہوتا ہے۔ اخلاق کامل ہوتے ہیں۔ مختصر سی عبارت میں یوں سمجھئے کہ وہاں کی تربیت کی غایت اصل، اعلیٰ کردار کا حصول ہوتا ہے۔

ڈکرولی سسٹم میں، ایک اور بات بھی ہے، اس سسٹم میں، مدرسہ اور گھر میں بھی پورا تعاون، اور ربط ملحوظ رکھا جاتا ہے ڈکرولی کی تربیت گاہ میں مستقل تعلق، گھر اور مدرسہ، معلم اور باپ کے درمیان قائم رہتا ہے۔ وہاں آبا کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ مدرسہ آئیں۔ اور اساتذہ سے، مدرسہ اور طلبا رکی فلاح و صلاح کے سلسلہ میں بحث و گفتگو، صلاح و مشورہ کریں۔ غرض اس سسٹم میں طلبہ کو ہر جہت اور ہر اعتبار سے کامل بنانے کی خاص کوشش کی جاتی ہے، اور ان کی تمام صلاحیتوں کو نہایت ملاطفت کے ساتھ اُبھارنے اکسانے اور بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۵۶)

(۷) طریقۂ اعجاب

یہ سسٹم، دوسرے طریقوں سے بالکل الگ اور مختلف ہے، اس میں تکلّم سے زیادہ سماعت کو دخل ہوتا ہے۔ اسی طرح عمل سے زیادہ قابلیت کو دخل ہوتا ہے۔ اس میں تاثر زیادہ ہوتا ہے، مؤثریت کم۔

میں ایک واقعہ اب تک نہیں بھولا، امریکہ کے ایک ثانوی مدرسہ میں ایک مدرس کی تقریر میں بیٹھا سُن رہا تھا۔ انگریزی ادب کی نئی کتابوں پر وہ بحث و گفتگو کر رہا تھا۔ اس کا انداز تقریر نہایت جامع اور دل نشین تھا۔ موقع موقع سے کتابوں کے اقتباسات بھی پڑھ رہا تھا۔ میں نے اسوقت طلباء پر ایک نظر ڈالی، سب اس محویت کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ صاف معلوم ہو رہا تھا اُنکے شعور میں حرکت پیدا ہو رہی ہے اُن کی رگوں میں خون جما ہوا ہے اور وہ اس سحر حلال سے بڑی طرح متاثر ہیں۔ اسوقت اگر ناقوس بھی بجایا جاتا۔ تو ان کی محویت میں فرق نہ آتا۔

(۵۷)

(۸) طریقہ ابتکار و انتاج

اس سسٹم میں طالب علم خود اپنے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ
معلم کی رہنمائی میں سابق معلومات سے اور فکر و خیال، بحث
و اطلاع، مقالات کی کتابت، قصیدہ کی تحریر، قوت متخیلہ
سے کام لے کر کسی نقش کے ارتسام، یا کسی تصویر کی خط کشی
یا کسی تاریخی حادثہ کی رنگ آمیزی، یا تجارب کے اجرا، یا ہاتھ
سے کرنیوالے کاموں کے اشتراک، یا آلۂ موسیقی و غنا سے استمداد
یا مسائل ریاضیہ کا حل، یہ اور اس طرح کے سارے کام طالب علم کو
زیادہ تر خود اپنے نفس، اور فکر، اور خیال کی رہنمائی میں کرنے
پڑتے ہیں۔ کمتر ایسا واقعہ پیش آتا ہے کہ وہ استاد کی رہنمائی
کا محتاج ہو۔ اور اس کی ہدایت اور صلاح و مشورہ پر اپنے

یہاں یہ فرق بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تعلیم کے وقت، جب قدیم مدرسوں میں رٹنے، اور زبانی یاد کرنے پر ساری قوت صرف کی کی جاتی ہے۔ جدید مدرسوں میں خود نتائج کے مرتب کرنے اور خود مشکلات کے حل کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ اور یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہے۔

(۵۸)

(۹) طریقہ تدریب و مرانت

تعلّم کے لزومات میں سے تکرار بھی ہے۔ بغیر مشق و تمرین، یعنی بغیر تکرار اور اعادہ کے حقیقت تک پہنچنا، مقصد کا حل کرنا، اور علم کا مستحضر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مکتب سے لے کر یونیورسٹی تک ہر دَور، اور ہر مرحلہ میں اس اصول کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے، لیکن اس تکرار و اعادہ سے مطلق، طوطے کی رٹ نہیں ہے کہ بغیر سوچے سمجھے، تکرار کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے، فہم و فکر کے ساتھ۔

ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ مشق و تمرین سے انسان درجہ کمال تک پہنچ جاتا ہے، لیکن ضروری ہے کہ یہ مرانت، انتباہ اور رغبت، اور ارادہ کے ساتھ ہو۔ تعلیم کے ساتھ عمل کا پہلو

پیشِ نظر رہے، مشق و تمرین اور ارادہ مراجعت کے سلسلہ میں ماہرین تعلیم نے جو اصول منضبط کیے ہیں۔ وہ یہ ہیں ۔

(۱) مشق کا مقصد واضح ہو۔
(۲) درس کے نکات ملحوظ خاطر ہوں۔
(۳) ان نکات سے دوسرے اسباق میں بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو۔
(۴) تکرار و اعادہ، رغبت اور ارادہ پر مبنی ہو۔
(۵) اختصار پیش نظر رہے۔
(۶) مشکل مسائل پر پوری توجہ کی جائے۔
(۷) نظر کی گہرائی سے کام لیا جائے۔
(۸) زبانی یاد کرنے میں اصولِ کلی پیشِ نظر ہو۔

(۵۹)

(۱۰) طریقۂ ارشادیہ

تعجب کی بات ہے کہ یہ سسٹم، ہمارے ابتدائی اور ثانوی مدارس میں اب تک غیر مانوس سا ہے۔ اس سسٹم کی رو سے طالب علم کو، مدرس کی ہدایت اور نگہداشت سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع ملتا ہے، ایک بھی طالب علم تن تنہا کوئی سبق اتنی اچھی طرح یاد نہیں کر سکتا، جتنا وہ اُستاد کی موجودگی اور نگرانی میں تیزی اور سرعت کے ساتھ یاد کر سکتا ہے، اگر ضرورت ہو، تو بیچ بیچ میں اُستاد سوالات کر کر کے، اس کی یادداشت کو تیز اور قوت حافظہ کو قوی کر سکتا ہے۔

اس ضرورت کے محتاج یوں تو سب ہی طلبہ ہوتے ہیں، لیکن ضعیف اور متوسط قابلیت کے طلبہ کے لئے تو یہ طریقہ اکسیر ہے۔

انہیں اس سے بہت زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ نئے طرز کے مدرسوں
میں اس سسٹم کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ ہر جماعت کے لئے
کم سے کم ایک گھنٹہ روزانہ اس طرز تدریس ــــ طریقہ ارشاد ــ
کے لئے وقف ہوتا ہے۔ اس نصاب کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے
اور اسے پوری اہمیت دی جاتی ہے۔ اس موضوع پر بہت سی
کتابیں بھی ہیں، جن میں بتایا گیا ہے کہ ہم کیوں کر یاد کریں۔"

ز

(٦٠)

(۱۱) طریقۂ اختیار

طریقۂ اختیار بھی طریقہ ارشادیہ ہی کی ایک قسم ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب میں کولمبیا یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو میرے اُستاد تو اس اسکندر جو تعلیم و تربیت سے متعلق بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فرمایا کرتے تھے۔ "پڑھاؤ اور پرکھو۔ پڑھاؤ اور امتحان لو"۔

اختیار سے مراد ہے مراجعت، ایک ماہر معلّم، اچھی طرح جانتا ہے کیوں کر، اور کب وہ اس سسٹم سے فائدہ اٹھائے؟ اور اپنے طلبہ میں سے کن طلبہ کو اس اصول کی زد میں لائے۔

تدریس و تعلیم کے یوں تو بہت سے اصول اور ضابطے ہیں۔ لیکن ذیل میں ہم چند خاص اور اہم اصولوں اور ضابطوں

کا ذکر بطور خلاصہ کرتے ہیں، کیونکہ ان میں سے اکثر ہم گزشتہ صفحات میں بسط و تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

(۱) طریقۂ استقرائیہ
(۲) طریقۂ قیاسیہ
(۳) طریقۂ اخباریہ
(۴) طریقۂ سقراطیہ

طریقۂ تنقیہہ، حسب ذیل اصولوں پر مشتمل ہے۔

(۱) ڈالٹن سسٹم
(۲) مانٹسوری سسٹم
(۳) طریقۂ تمثیلیہ
(۴) طریقۂ مشروع
(۵) طریقۂ لعب
(۶) ڈکرولی سسٹم
(۷) طریقۂ اجاب
(۸) طریقۂ ابتکار و انتاج
(۹) طریقۂ تدریب و مزاولت
(۱۰) طریقۂ ارشادیہ
(۱۱) طریقۂ اختیار

(۶۱)

سوالات کی اہمیت

تعلیم و تدریس میں، سوال و جواب کو بھی اچھی خاصی اہمیت حاصل ہے
اور ماہرین تعلیم و تربیت اسے ایک اہم عنصر قرار دیتے ہیں۔

سوالات کے اغراض

سوالات کے اغراض یوں تو بہت سے ہیں
چند خاص الخاص یہ ہیں۔

(۱) طلبہ کل جو سبق پڑھ چکے ہیں، اور آج انھوں نے جو پڑھا ہے ان
دونوں میں بہترین ربط سوال و جواب سے پیدا ہو سکتا ہے۔

(۲) معلومات و اذہان کو طلبہ کے ذہن و دماغ میں راسخ کرنا ہو،
تو سوال و جواب سے بڑی مدد لی جا سکتی ہے۔

(۳) حقیقت تک پہنچنے کے لئے فکر و انتباہ اور بحث کو بھی سوال و
جواب کی اساس و بنیاد، بنایا جا سکتا ہے۔

(۴) عمل کا شوق، ثواب کی طرف رغبت، اچھے کاموں کی طرف میلان بھی سوال و جواب رہین منت ہوتا ہے۔

شروط اسئلہ سوالات کا صحیح مقصد پورا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ سوالات کے شروط پورے کئے جائیں جو یہ ہیں۔

(۱) سوالات سہل ہوں، فکر عمیق کے طالب نہ ہوں۔

(۲) سوالات مختصر لیکن واضح ہوں۔

(۳) ایسے سوالات ہوں، کہ طلبہ میں انتباہ اور اصغاء کا مادہ پیدا ہو۔

(۴) سوالات عام نہ ہوں محدود ہوں کہ طلبہ کو ظن و تخمین اور قیاس آرائی کا زیادہ موقع نہ ملے۔ سوال ایک حقیقت معینہ تک محدود ہو، اور اس کا جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہو۔

(۵) تکلیف سے بری ہو۔

(۶) ایسا سوال ہو کہ تمام طلبہ میں جواب دینے کی اُمنگ پیدا کر دے۔

(۷) طلبہ کی استعداد اور اہلیت سے مطابقت رکھتا ہو۔ ہر طالب علم یہ سمجھے کہ وہ اس کا جواب دے سکتا ہے، اور یہ کہ یہ سوال اس سے کیا گیا ہے۔

(۸) ایسا سوال بھی نہ ہو، جو طلبہ کو غور و فکر سے محروم کر دے۔

اس سلسلہ میں مدرّس کو چند اور باتیں بھی پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ اگر سوال طلبہ کو مشکل معلوم ہو تو حکمت کا تقاضا یہ ہی

کہ اسے کسی دوسری شکل میں اُلٹ پلٹ دیا جائے، یہاں تک کہ اس کا جواب آسان ہو جائے۔ معلم کو ایک اور قیمتی اصول پر بھی پوری توجہ کرنی چاہیئے۔ یہ کہ وہ اپنے سوالات کے ذریعہ ہمیشہ طلبہ کو فکر و تامل پر اکسائے، تاکہ ان کی قوت ملاحظہ و تفکر میں نمو پیدا ہو۔

اچھے سوالات کے ذریعہ طالب علم کو آنے والے درس کے لئے خوبی کے ساتھ تیار کیا جا سکتا ہے انہیں اعادہ اور مراجعت پر بھی آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک قول ہے۔ اور بڑا اچھا قول ہے کہ "اچھا سوال آدھا علم ہے"

سوالات کے فوائد

سوالات کے بہت زیادہ فائدے ہیں، اس سے طلبہ میں انتباہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جواب دینے کے سلسلے میں غور و فکر کی عادت پڑتی ہے، حفظ نظام میں مدد ملتی ہے۔ اگر آپ دیکھیں کہ اثنا ردرس میں کوئی طالبعلم کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہے تو درس کے سلسلے میں اس سے سوالات شروع کر دیجئے یا اگر آپ دیکھیں کہ دوران سبق میں کوئی طالب علم کسی خیال میں کھویا ہوا ہے تو سبق سے متعلق اس سے سوالات شروع کر دیجئے۔ اُسے اپنے سوالات سے افساد نظام کا کوئی موقع نہ دیجئے وہ بڑی آسانی سے راہِ راست پر آجائے گا۔ سوالات کو پیمانہ کے طور پر بھی ایک مدرس استعمال کر سکتا ہے۔ سوالات سے بڑی آسانی کے ساتھ مدرس اندازہ لگا سکتا ہے، کہ کو طالب علم ضعیف

ہے، کون قوی؟ کس میں اختیار کی قوت ہے، کون ناکارہ؟ کس پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے، کس پر کم؟ پھر اسی اندازہ کے مطابق وہ ضعیف کو قوی بطی کو ذہین بدشوق کو شوقین بنانے کی کوشش کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ اس طرح اصلاح کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔

سوالات سے مدرس کے حسن ذوق اور قابلیت کا بھی صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ سوالات جس طرح طلبہ کی معرفت کی کسوٹی ہیں اسی طرح مدرس کی معرفت کا بھی پیمانہ ہیں۔ سقراط نے بھی اپنے نظام تعلیم و تدریس میں سوالات کو پوری پوری اہمیت دی ہے۔

سوالات کی نوعیت

سوال کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا جواب کیسا دیا جا سکتا ہے؟ درس کی ابتدا میں سوالات کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے کہ مدرس اندازہ کر سکے کہ سابقہ اسباق کہاں تک مستحضر ہیں؟ اور دوران درس میں سوالات کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے۔ جو آنیوالے درس میں بھی کام دے اور اس سبق کی تکمیل میں بھی تعاون ہو۔ اور قدم بہ قدم ان میں ملاحظہ، مشاہدہ فکر اور غور کی صلاحیت پیدا ہوتی جائے۔ درس کے آخر میں سوالات کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے کہ اس کے اجزاء ایک دوسرے سے مربوط اور متصل ہو جائیں اور یہ معلوم نہ ہو سکے کہ طلبہ کی سمجھ میں کون سا مسئلہ آیا، اور کون

سامسئلہ وہ نہیں سمجھ سکے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ سوالات بہت سود مند ہوتے ہیں، تو ہمارا مطلب و مدعا یہ نہیں ہوتا کہ درس از اول تا آخر سوالات ہی پر مشتمل ہو، اور یہ عقیدہ بھی نہیں ہے کہ جو مدرس اچھا سوال کریگا وہ اچھا سبق بھی دے گا، یہ مبالغہ ہے اور ہم اس سے دور ہیں۔ تعلیم و تربیت سوالات ہی سے عبارت نہیں ہے۔ اگرچہ ہم اس کی ضرورت اور افادیت کے منکر بھی نہیں ہیں؛

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے، کہ طلبہ، ہر وقت سوالات ہی کے مستحق نہیں ہوتے ہیں۔ اخبار و اطلاع اور معلومات کے بھی مستحق ہوتے ہیں ان سے صرف پوچھنا ہی نہیں چاہئے۔ بتانا بھی چاہئے۔ بعض مدرس سوالات تو بہت کرتے ہیں، بتاتے کم ہیں۔ یہ ان کی افسوسناک غلطی اور کوتاہی ہے، ایسا نہیں ہونا چاہئے، پوچھئے بھی اور بتائیے بھی، اس پوچھنے اور بتانے میں پورا پورا توازن ہونا چاہئے۔

اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ دوران درس میں اگر کوئی قصہ بیان کیا جائے، تو قصہ بیان کرتے کرتے سوالات کا سلسلہ نہیں کرنا چاہئے، بلکہ جب قصہ بیان ہوئے، تب سوالات کئے جائیں۔ سوالات کا مقصد یاد رکھنا چاہئے۔ یا تو تلخیص و مراجعت ہوتا ہے یا تعبیر و توضیح، سوالات کرتے وقت اس مقصد کو نظر سے اوجھل نہیں ہونا چاہئے۔

۱

(۶۲)

جوابات

اب ہم جوابات کی صورت و نوعیت کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں، مدرس کو جس طرح سوالات پر پوری توجہ کرنی چاہئے، اسی طرح جوابات پر بھی اسے اپنی پوری توجہ مبذول رکھنی چاہئے۔ جوابات ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ طالبعلم نے مسئلہ کو کہاں تک سمجھا ہے؟ اور اس کی فہم و استعداد کا کیا عالم ہے؟ اگر درس ناقص، اور نامکمل ہوگا تو جوابات کبھی بھی صحیح اور درست نہیں ہوسکتے۔

جوابات کے شرائط جواب اچھا اور مکمل اس صورت میں ہو سکتا ہے، کہ اس کی عبارت معقول ہو۔ فکر و لغت کی غلطیوں سے مبرا ہو، ظن و

تخمین کا اس میں دخل نہ ہو، حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہو۔ تکلف سے کام نہ لیا گیا ہو۔ اس کی ترتیب منطقی ہو، نظم و فکر پر دلالت کرتا ہو۔

بعض مدرس اس معاملہ میں بھی زیادتی اور غلو سے کام لیتے ہیں، وہ چاہتے ہیں طالب علم کا جواب مکمل جملہ کی صورت میں ہو، اگرچہ جواب ایک کلمہ سے زیادہ کا طالب نہ ہو۔ مثلاً" اگر کسی طالب علم سے سوال کیا جائے "یہ واقعہ کب رونما ہوا؟ تو مدرس صاحب اس جواب سے مطمئن نہیں ہونگے کہ" فلاں سنہ میں"۔ بلکہ وہ چاہیں گے طالب یوں کہے، " یہ واقعہ فلاں سنہ میں رونما ہوا تھا!" یہ جواب ضرورت سے زیادہ ہے اس طوالت پر کبھی اصرار نہیں کرنا چاہیے، یہ بات سوال کی نوعیت پر منحصر ہے کہ وہ جواب میں جملہ تمام چاہتا ہے یا کلمہ واحدہ! نوعیت کا جو تقاضا ہو۔ اس پر جواب منحصر ہونا چاہیئے اور اسے قبول کر لینا چاہیئے۔ خواہ مخواہ کی مین میخ نہیں نکالنا چاہیئے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ تلمیذ کا جواب جملہ، تمام پر مشتمل ہو، تو ہمیں سوال بھی ایسا کرنا چاہیئے جس کا جواب صرف جملہ، تام ہی کی صورت میں دیا جا سکتا ہو۔ ہمیں ایسا سوال نہیں کرنا چاہیئے۔ جس کا جواب کلمۂ واحد کی صورت میں دیا جا سکتا ہو۔

جواب کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں، یا وہ صحیح ہوگا، یا غلط ہوگا، یا اس کا کچھ حصہ صحیح ہوگا، اور کچھ غلط۔ اب ماہر مدرس کا کام یہ ہے، کہ وہ اس طرح الٹ پلٹ کر اپنا سوال دہرائے کہ جواب میں کوئی خطا یا غلطی نہ رہنے پائے۔ جواب کی غلطی کے کئی اسباب ہوتے ہیں، یا تو طالب علم سوال پوری طرح سمجھا نہیں ہے، یا اس کا علم ناقص، اور معلومات کوتاہ ہیں۔ یا اس کا حافظہ کمزور ہے، اور وہ یادداشت ناقص ہے یا سوال کی عبارت پیچیدہ ہے۔ جواب کو یہ کہہ کر رد کر دینا کہ یہ غلط ہے کافی نہیں، نہ یہ کوئی معقول علاج ہے۔ علاج یہ ہے کہ طالب علم کے قدم بہ قدم چل کر اس غلطی کی تصحیح کی جائے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی غلطی محسوس کر لے، صواب کو پہچان لے۔ اور حقیقت تک اس کی رسائی ہو جائے۔

مدرس اگر یہ چاہتا ہے کہ اس کے الفاظ اور آراء میں وزن ہو، اس کی تعریف یا تنقیص کی قدر و قیمت طلبہ کے دل میں ہو تو اسے چاہیے، اپنے شاگردوں میں سے ان کی مدح کبھی نہ کرے جو مدح کے مستحق نہیں ہیں، نہ ان جوابات کی پذیرائی کرے۔ جو رد کر دینے کے قابل ہوں، اس کا فرض ہے کہ وہ غلطی کے بارے میں چشم پوشی اور درگزر سے کام نہ لے، بلکہ بلاغت اور ملاطفت کے ساتھ اسے طالب علم پر واضح کر دے، تاکہ پھر اس کا احتمال

باقی نہ رہے، اور طالب علم جواب کی طرف راجع ہو جائے۔
بعض اساتذہ وقت بچانے کے لئے یہ کرتے ہیں کہ خود طلبہ میں سے ایک دوسرے کو سوال و جواب پر لگا دیتے ہیں ایک سوال کرتا ہے دوسرا جواب دیتا ہے، مدرس نگرانی اور نگہداشت کرتا رہتا ہے اس طرح طلبہ میں سوال کرنے، اور جواب دینے، دونوں باتوں کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔
بعض مدرسوں میں یہ بڑی خرابی ہوتی ہے کہ وہ موقع بے موقع بولنے کے عادی ہوتے ہیں، وہ چاہتے ہیں، کہ خود ہی سوال کریں اور خود ہی جواب دیں، کیونکہ یہ عادت طلبہ کیلئے مضر ہے انہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، الٹا نقصان پہنچ جاتا ہے۔ مکتب سے لے کر ثانوی مدرسہ تک کہیں بھی اس عادت کو جاری نہیں رکھنا چاہیئے۔

ختم

(۶۳)

وسائلِ ایضاح

مسئلہ یا سبق کی وضاحت اگر صحیح اسلوب پر کی جائے، تو بہت سی مشکلیں اور دشواریاں طلبہ کی رفع ہو جاتی ہیں۔ وضاحت کے وسائل ہیں، امثلہ، متعلق تختہ سیاہ پر چاک کی مدد سے نقوش، نمونے، تصویریں بہت زیادہ کامیاب ہیں۔

اب ہم ایضاح کے چند وسائل کا ذکر کرتے ہیں۔

نمونے اور تصویریں ایضاحِ حسیہ کے وسائل میں یہ چیز اچھی طرح سمجھ میں آجائے مبادی علوم میں طیور اور نباتات سے کافی مدد ملتی ہے۔ اگر مدرس یہ دیکھے کہ نباتات یا طیور کی موجودگی ممکن نہیں تو وہ ان کی تصویر کشی کرکے وضاحت کر سکتا ہے۔ ہوائی جہاز، سائیکل، ریل

جہاز، آبدوز، یا دُوربین کی موجودگی سے بھی کافی وضاحت ہو سکتی ہے۔ اگر یہ چیزیں بھی درجہ میں نہ ہوں، یا نہ لائی جاسکیں تو تختہ سیاہ پر ان کی نقاشی اور تصویر کشی سے بھی وضاحت کی جاسکتی ہے،

سینمائی افادیت

موجودہ زمانہ میں سینما بھی وسائل ایضاح میں ایک اہم اور بیحد منفعت بخش وسیلہ اور ذریعہ ہے، امریکہ، برطانیہ اور یورپ کے متعدد شہروں میں یونیورسٹیاں اور کالج اور مدرسے، سینما سے، جغرافیہ علمی مسائل طبعی مسائل، تاریخی حقائق کے سلسلہ میں خوب مدد لیتے ہیں۔ اس طرح مذکورہ فنون کے اسباق طلبہ کے ذہن ودماغ میں اچھی طرح راسخ ہو جاتے ہیں۔ سنیما کو وسیلہ اور ذریعہ بنا کر وہ بڑے بڑے جنگلوں کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ بڑے بڑے درخت کس طرح کاٹے جاتے ہیں۔ یہ معلوم کر لیتے ہیں۔ لکڑی پر کٹنے کے بعد کون کون سی تکوینی کیفیتیں گزرتی ہیں، اور بالآخر وہ میز، کرسی، چوبی گھوڑے، یا فرنیچر کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے، یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ سینما کے ذریعہ سے نباتات کے ادوار نمو نظر کے سامنے آجاتے ہیں بیج کس طرح ڈالے جاتے ہیں؟ نباتات کا ظہور کس طرح ہوتا ہے؟ فصل پکتی کیوں کر ہے؟ کاٹی کس طرح جاتی

ہے ؟ ان سب چیزوں کا بہ حسن و خوبی مشاہدہ ہو جاتا ہے وحشی جانوروں کا جنگل میں کس طرح شکار کیا جاتا ہے؟ وحشی جانوروں کے بچوں کو کس طرح پالا پوسا جاتا ہے ؟ اور کس طرح انہیں مانوس کرکے قابو میں لایا جاتا ہے ؟ ان سب چیزوں کا بھی اچھی طرح سے مشاہدہ ہو جاتا ہے ۔ غیر ممالک کے لڑکے کس طرح مدرسوں میں رہتے ہیں پڑھتے ہیں، کھیلتے ہیں، تربیت حاصل کرتے ہیں، ان کی زندگی کس طرح گزرتی ہے ؟ یہ سب باتیں بھی بیک وقت مشاہدہ میں آجاتی ہیں، غرض وہ مسائل جن کی معرفت بہت زیادہ محنت مصارف اور دشواری کا باعث ہے۔ سینما کے ذریعہ چٹکی بجاتے حاصل ہو جاتی ہے۔

سینما کے ذریعہ بچوں ہی کو نہیں بڑوں کو بھی فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے ، بیماری کس طرح پھیلتی ہے ؟ مرض کس طرح حملہ کرتا ہے ؟ جراثیم کیوں کر کام کرتے ہیں ؟ یہ سب باتیں پردۂ سیمیں پر بآسانی دیکھی اور سمجھی جا سکتی ہیں ۔

لیکن سینما کی موجودہ صورت مصلح نہیں ہے اس میں خامیاں بھی ہیں ، ان کی اگر اصلاح کر لی جائے تو بہت مفید بنایا جا سکتا ہے

اکسکرشن

سیر و سفر اور اکسکرشن سے بھی بہت فائدہ ہوتا ہے ۔ ایضاح حسیہ کے وسائل میں اسے اہم

درجہ حاصل ہے، کھیتی کے مشاہدہ سے اور آثار قدیمہ کی زیارت سے بہت سے نکتے حل ہو جاتے ہیں۔

تختہ سیاہ

تختہ سیاہ پر چاک سے کام لے کر مدرّس بہت سی باتیں حل کر سکتا ہے اور طلبہ کی دماغی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔ مشکل کلمات کا حل، دشوار قاعدہ کی تشریح، نقاشی، اور مصوری میں تختہ سیاہ بہت کام دیتا ہے

(۶۴)

لغوی وسائل ایضاح

لغوی وسائل ایضاح بھی تدریس و تعلیم کے فن میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ان میں سے چند کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

عبارت سے وضاحت امثال، قواعد، نظریات، مالوقہ کا ذکر کر کے ایضاح عبارت سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اگر طالب الفاظ، مفردات ترکیبات، سے مفہوم کی تہ تک نہ پہنچ سکے تو امثال سے وضاحت کا کام لیا جاتا ہے اور طالب علم کی رسائی حاصل کی جاتی ہے۔

قصہ اطفال افسانہ و قصص سے خواہ واقعی ہوں یا خیالی سبق آموز ہوں یا مہمل، بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ ادبی

علمی، جغرافیائی، اور تاریخی کہانیوں سے بھی انہیں بہت شغف ہوتا ہے، ایک ماہر مدرس کا ان قصّے کہانیوں سے طلبہ کو بہت فائدہ پہنچتا ہے اور چھانٹ چھانٹ کے ایسی کہانیاں سُناتا ہے جو خفی کو جلی کر دیتی ہیں۔ مشتبہ کو حقیقت بنا دیتی ہیں۔

مغرب میں طلبہ کے لئے فن افسانہ گوئی نے بڑی ترقی حاصل کر لی ہے، وہاں ہزاروں کی تعداد میں ایسی کہانیاں رائج ہیں، اور کتابوں کی صورت میں موجود ہیں، جو ہر عمر اور ہر درجہ کے بچے کے لئے بہت انتہا مفید اور سود مند ہیں۔ عربی کے قدیم طرز تدریس میں بھی یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بڑی عمدہ، مفید اور بیش بہا کتابیں۔ مثلاً اغانی امالی، عقد الفرید وغیرہ موجود ہیں، موجودہ دور کی رعایت کو پیش نظر رکھ کر، اگر ان کی از سرِ نو ترتیب دی جائے، اور ان میں سے کام کی باتیں اخذ کی جائیں تو بہت فائدے دکھائے جا سکتے ہیں۔ قصص عنترہ، الف لیلہ، ابو زید ہلالی، کلیلہ و دمنہ، ذخیرۂ قصصیہ، وغیرہ سے بھی عربی میں بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس لٹریچر سے نہ ہم فائدہ اٹھاتے ہیں، نہ ہماری اولاد۔

وصف قوت بیان سے بھی طلبہ کو بہت فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ یعنی ایسی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کسی

مسئلہ کی وضاحت کی جائے کہ طلبہ کے دل میں بات اچھی طرح بیٹھ جائے۔ اگر آپ کسی جنگ کا حال بیان کریں، تو اس کا نقشہ اس طرح کھینچیے، کہ طلبہ یہ سمجھیں وہ میدان جنگ میں اپنی آنکھوں سے حزب و قتال کے مناظر دیکھ رہے ہیں۔

مدرس وصف و بیان کے فن سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر زبان اور لٹریچر پر اسے غیر معمولی دسترس نہ حاصل ہو۔ ضروری ہے کہ مدرس اس فن کی طرف پوری توجہ کرے۔

شرح و تفسیر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سخت الفاظ تلمیذ سے حل نہیں ہوتے؛ یا پیچیدہ عبارت اس کی سمجھ میں نہیں آتی، اور وہ ایک مشکل میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ مدرس اس کی ایسی شرح و تفسیر کرے کہ بات پورے طور پر اس کی سمجھ میں آجائے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ طفل خود ایسا سوال کر بیٹھتا ہے جو شرح و تفسیر کا محتاج ہوتا ہے۔ مثلاً آسمان نیلگوں کیوں ہے؟ درخت ہلتے کیوں ہیں؟ ریل چلتی کیوں ہے؟ ان سوالات سے طفل کے جذبۂ علم و اطلاع پر روشنی پڑتی ہے۔ اب استاد کا کام یہ ہے کہ وہ اس طرح جواب دے جو طفل کی عقل اور ذہن سے مناسبت رکھتا ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ جہاں مدرس کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ وہ وسائل ایضاح سے کام لے، وہاں ہم اسے یہ مشورہ بھی دیتے ہیں، کہ ان وسائل کے برتنے میں مبالغہ اور غلو سے کام نہ لے۔ ایسا بھی ہونا چاہیئے کہ جو کچھ باتیں ہم اس سے ذکر کریں، اور اسے خود خیال آرائی کا موقع دیں۔ بجائے اس کے شرح و توضیح فی الفور شروع کردیں۔ مدرس اگر ماہر ہے تو وہ خود ہی سمجھ سکتا ہے کہ کون سا موقع شرح و وضاحت کا ہے، اور کون سا سکون و سکوت کا؟

ؤ

(۶۵)

اسباق کے انواع

مدرسہ کی تعلیم کا مقصد ہے۔ کسب علوم و معارف ، اور کسب کا مقصد ہے۔ حذاقت و مہارت، درس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) معلومات

(۲) مہارت

(۳) ذوق و وجدان کی تربیت

اب ہم ان میں سے ہر ایک پر گفتگو کرتے ہیں۔

معلومات معلومات کا مقصد ہے ، حقائق تک پہنچنا ، وہ حقائق جو طلبہ کے لئے غیر معروف ہیں، اُستاد کو یہ معلومات اس طرح پیش کرنا چاہئیں کہ طلبہ اکتا ئیں نہیں رغبت اور شوق سے یہ معلومات حاصل کریں، اور ان معلومات

کے ذریعہ حقیقت کی معرفت حاصل کریں۔

مہارت مہارت کا تعلق ہے، محاکات، مشق، تدریب اور تکرار سے۔ یہ کام ایک خاص اور معین طریقہ سے انجام پانا چاہیئے۔ تاکہ عمل میں پوری مہارت پیدا ہو سکے۔

ذوق و وجدان کی تربیت یہ وہ اسباق ہیں جن سے ذوق اور وجدان کی تربیت ہوتی ہے۔ جمالی احساس بیدار کیا جاتا ہے بچہ میں اچھی چیزوں کی طرف میلان پیدا کیا جاتا ہے اور بڑوں میں اچھی چیزوں کی پرکھ پیدا کی جاتی ہے۔

مدرس کو چاہیئے کہ وجدان کی تربیت بہت احتیاط کے ساتھ کرے۔ موسیقی کی طرف بھی مائل کرے، کہ یہ دل کی زبان ہے اور اس کا اثر سحرانگیز ہوتا ہے اسی طرح شعر اور تمثیل کی طرف بھی توجہ لازمی ہے کہ یہ بھی انسان کے ذوق اور وجدان پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ نقاشی کی طرف سے بھی غافل نہ ہونا چاہیئے کہ مصوروں کی زبان یہی ہے اور اس کا بھی دل و دماغ پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ایک معمولی آدمی سے پوچھیئے، کہ تم نے باغ میں کیا دیکھا؟ وہ کہے گا۔ گھاس پتے پھول اور ایک ایسا آدمی جس کے ذوق و وجدان کی تربیت ہو چکی ہو، میں نے وہاں ایک نئی زندگی دیکھی جو خدا کی قدرت نے پیدا کی ہے۔

طریق تدریس

سبق کی نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے تدریس و تعلیم کا طریقہ بھی بدلتا رہتا ہے جو طریقہ حساب کے درس کے لئے موزوں ہے۔ وہی نقاشی کے لئے قطعاً غیر موزوں ہے۔ یہ آسان نہیں ہے کہ ہم اس سلسلے میں کوئی خاص طریقہ وضع کر سکیں۔ اس کا انحصار خود مدرس کی مہارت اور حکمت عملی پر ہوتا ہے۔

البتہ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تدریس میں ہربرٹ کے اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ یعنی مقدمہ، غرض، احتیاط ضروری اجزا میں شامل ہے۔

وجدان کی تربیت و تکمیل کے سلسلے میں مدرس کو طریقہ اعجاب سے بھی کام لینا چاہیئے۔ یہ کہ متعلم سنے۔ اور جو کچھ سنے اور دیکھے، اس سے متاثر بھی ہو۔ پھر مدرس اپنی بات اس کے دل میں اُتار دے گا اور اپنے حسنِ بیان اور زورِ زبان سے اسے اپنی طرف مائل کرے گا اور اس کے اندر وہ جذبہ اُبھار دے گا، جو اس ذوق کی تکمیل و تربیت میں معاون اور مددگار ہو گا۔

ہربرٹ کے اصول پر عمل کرتے ہوئے، مدرس کو موازنہ سے بھی کام لینا چاہیئے۔ تلمیذ اور مدرس کے درمیان ہو۔ بعد میں مشق و تکرار سے بھی کام لیا جائے۔

(۶۶)

نصائح

طلبہ اور مدرسین کیلئے

(۱) اپنے درس کی تیاری پر توجہ کرو۔

(۲) مقدمہ کا مقصد، درس کے لیے، طلبہ کے اذہان کی تیاری ہے۔

(۳) دوران درس میں جو مقصد بیان کیا جائے، وہ کسی اور ذکر سے منقطع نہ ہونے پائے۔ اسے مسلسل رہنا چاہئے

(۴) وسائل ایضاح کے استعمال میں مبالغہ اور غلو سے ہرگز کام نہ لیا جائے۔

(۵) تدریس کا جو نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کیا ہے، اسے طلبہ کے سامنے ظاہر نہ کیجئے۔

(۶) آپ کے افکار میں منطقی ترتیب ہونی چاہئے۔ اعمال منظم

ہونے چاہئیں۔ سوال واضح ہونے چاہئیں۔

(۷) شرح کلمات میں مفرد الفاظ کے معنی کے طور پر جو لفظ بتائیے، وہ بہت زیادہ سہل ہو۔

(۸) تاریخی حقائق فقرہ کی شکل میں پیش کئے جائیں تو بہتر ہے۔

(۹) ایک وقت میں دو سوال نہ کیجئے۔

(۱۰) اثنائے کتابت میں طلبہ کی نشست بالکل ٹھیک ہونی چاہئے۔ تاکہ ان کی آنکھیں کمزور نہ ہوں، اور کمر کبڑی نہ ہو۔

(۱۱) غلطیوں کی اصلاح شافی جواب سے کی جائے۔

(۱۲) تختۂ سیاہ پر کوئی عبارت یا نقش نہ چھوڑیئے۔ فوراً مٹا دیجئے۔

(۱۳) وقت واحد میں متعدد احکام نہ دیجئے۔ اثنائے تکلم میں ہاتھ سے اشارے نہ کیجئے۔ طلبہ کو جواب دینے کے بعد کھڑا نہ رہنے دیجئے۔

(۱۴) اپنے کورس کی ہر جہت سے تیاری کر کے کلاس میں تشریف لے جائیے۔

(۱۵) تکلف سے دور رہیئے۔

(۱٦) حوادث یومیہ اور سوسائٹی سے پورا فائدہ اٹھائیے۔

(۱۷) دوران تدریس میں ضرورت کی تمام چیزیں اپنے پاس موجود رکھیے۔ مثلاً کتاب، قلم، پنسل، دوات اور دوسری متعلق چیزیں۔

(۱۸) طلبہ سے ایسے سوالات نہ کیجیے جن کے جوابات تختہ سیاہ پر لکھے ہوئے ہوں، پہلے انہیں مٹا دیجیے پھر سوال کیجیے۔

(۱۹) دوران درس میں حسب ضرورت تختہ سیاہ کو وقتاً فوقتاً استعمال کرتے رہیے۔

(۲۰) عمل کتابی کے دور میں مدرس کو نگہداشت اور نگرانی کا کام جاری رکھنا چاہیے۔

(۲۱) دوران تعلیم میں مدرس کو اپنی جد و جہد کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے۔

(۲۲) غلطی کو درست کرکے لکھنے کی طلبہ میں عادت ڈالنی چاہیے۔ املا یا زبان کی غلطی ہوگی، تو تکرار و اعادہ سے خود بخود ٹھیک ہو جائیگی

۲۳۔ مدرس کو ہمیشہ چوکس رہنا چاہیے۔

(۲۴) مدرس کو چاہیے کہ وہ طلبہ کی استعداد و اہلیت کا لحاظ رکھے

(۲۵) مدرس کو اس طرح تیار ہو کر درجہ میں جانا چاہیئے کہ ہر طالب علم اس سے پورے طور پر مستفید ہو سکے۔

(۲۶) کمزور طلبہ پر مدرس کو خاص توجہ کرنی چاہیے، تاکہ وہ دوسروں کے برابر ہو سکیں۔

(۲۷) سبق میں جو مشکل الفاظ یا جملے ہوں، ان کے معنی تختہ سیاہ پر بھی

لکھ دیئے جائیں اور طلبہ کی نوٹ بک میں بھی نوٹ کروائے جائیں

(۲۸) وقت کی مناسبت سے طلبہ کو موضوع دینا چاہیئے۔ مثلاً رمضان میں روزہ کا موضوع، بارش کا موضوع موسم گرما میں دینا چاہیئے، نہ کہ موسم سرما میں۔

(۲۹) مدرس کا اثر طلبہ پر بہت گہرا ہوتا ہے۔

(۳۰) طلبہ پر بھروسہ کرو۔ انہیں اپنے کام میں شریک کرو۔ انہیں غور و فکر کا موقع دو۔ ان کے لئے عمل کی فرصت مہیا کرو جب وہ مدرس کے محتاج ہوں، مدد کرو۔

(۳۱) اوقات درس کے دو حصے ہونے چاہئیں۔ نصف اوّل کتابی تعلیم کے لئے، نصف آخر دستی تعلیم کے لئے۔

(۳۲) طالب علم سے اگر غلطی ہو، تو اس کی اصلاح کر کے قاعدہ اور نظریہ کی تشریح کر کے پھر سمجھاؤ۔

(۳۳) طلبہ کے پرچہ ہائے امتحانات اچھے چھپے ہوئے ہوں۔ کتابت صاف ہو۔

ان ہدایات پر اگر عمل کیا جائے، تو بڑی آسانی سے طلبہ کو ہموار کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کی صحیح تربیت کر کے انہیں مرد کامل بنایا جا سکتا ہے۔

ؔ

(۶۷)

ضمیمہ نمبر ۱

اس کتاب کے عربی ماخذ

۱۔ مقدمۂ ابن خلدون

۲۔ احیاء علوم الدین للامام غزالی

۳۔ اصول التربیۃ والتعلیم للمرحوم احمد خیر الدین

۴۔ تاریخ التربیۃ للاستاذ مصطفےٰ امین بک

۵۔ "فی علم النفس" للاستاذ حامد عبد القادر۔

۶۔ "فی علم النفس" للاستاذ حامد عبد القادر و محمد عطیہ ابراشی

۷۔ تفریر مسترمان

۸۔ مجلۃ التربیۃ الحدیثہ للجامعۃ الامریکیہ

۹۔ بالقاہرہ۔

۱۰۔ التربیۃ الانگلزیہ۔

۱۱۔ الشخصیۃ۔